چند دن

محدثین وفقہاء کی بارگاہ میں!

اسلامی تاریخ کے علمی مراکز کا سفرنامہ، جس میں وہاں کی تاریخ اور مسلمانانِ ہند کیلئے عبرت وموعظت کے پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے اور اس طرح سفر کی رُوداد لکھی گئی ہے کہ گویا قاری بھی مصنف کے ساتھ ہے، دلچسپ اور سبق آموز۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

دارالحمد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سورت، گجرات

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ

طبع اول ۱۴۴۳ھ، ۲۰۲۲ء

کتاب : چند دن محدثین وفقہاء کی بارگاہ میں!

تالیف : حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

صفحات : ۴۸

کمپیوٹر کتابت : مولانا محمد نصیر عالم سبیلی (فون نمبر: 9959897621)

العالم اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر: 8919409102

سن اشاعت : شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ، مارچ ۲۰۲۲ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار (1000)

ناشر

دارالحمد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سورت، گجرات

Mob: 7096176961 Email: darulhamd2017@gmail.com

ملنے کے پتے

- دارالحمد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، فون نمبر: 7096176961
- ادارۃ الصدیق ڈابھیل، فون نمبر: 9913319190
- مولانا بک ڈپو رانی تالاب، سورت، فون نمبر: 9228760716
- مفتی فرید کاوی (جامعہ علوم القرآن) فون نمبر: 9427822481

فہرست مضامین

☆ عرضِ ناشر : مولانا مفتی محمد طاہر سورتی	۵
☆ ابتدائیہ : حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم	۶
● تاشقند کی ایک شام	۱۳
● امام بخاریؒ کے قدموں میں!	۱۴
● سمرقند میں ایک دن	۱۷
● بخارا کی طرف	۲۴
● نَسَف اور ترِمذ	۲۶
● سیرِ تاشقند	۲۸
● ہلال نشر میں حاضری	۳۲
● اسلامی معاہد کا نصابِ تعلیم	۳۳
● چند نقوش عبرت وموعظت	۳۶
● تنہائی کے سایہ میں!	۳۹
● تنہائی کا سبق	۴۴

● ● ●

بسم الله الرحمن الرحيم

عرضِ ناشر

سفر نامہ ایک ایسی صنفِ تصنیف ہے کہ معلومات افزا ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی بے حد ہوتی ہے، اگر سفر نامہ کسی عالم کا ہو تو کیا ہی کہنے!!! اور اگر مصنف فقیہ ومجتہد اور تاریخ کا غواص ہو تو سطر سطر سمندر کی لہر ثابت ہوتی ہے، اور قاری کو ہر ایک تہہ میں دُرِّ نایاب سے نہال کر جاتی ہے، اور حسنِ اتفاق سے اگر وہ صاحبِ طرز ادیب اور باکمال انشا پرداز ہو تو پڑھنے والا خود کو بھی سفر میں شریک، اور ہر منظر کو اپنی نگاہ کے سامنے زندہ اور تابندہ پاتا ہے۔

اگر سفر قدرتی حسین مناظر سے لب ریز، دل فریب اور ہوش رُبا مقامات کا ہو تو ہم خرما وہم ثواب کی کیفیت ہوتی ہے، اِن مواضع کے ساتھ اگر تفسیر، حدیث اور فقہ کے ماہرین وشناوروں کی زریں یادیں وابستہ اور حسین نقوش ثبت ہوں، تو استفادہ کرنے والا بیک وقت مختلف النوع بدائع، لآلی ویواقیت سے اپنا دامن بھرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ جو سفر نامہ ہمارے ہاتھ میں ہے، وہ مذکورہ بالا جملہ محاسن سے مزین ہے، دارالحمد کی ٹیم اِس یادگار تقریب کے موقع سے رب کریم کی سپاس گزار ہے کہ اِس قیمتی سوغات کی اشاعت کی سعادت مرحمت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ محترم مصنف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ اسے منظر عام پر رکھنے کی خدمت ہمارے سپرد فرمائی، ابھی چند روز ہی ہوئے ہیں کہ حضرت مولانا مدظلہم کے "محاضرات ڈابھیل" پریس سے آکر قدردان ہاتھوں میں پہنچنا شروع ہو چکی ہے۔

۲ / شعبان ۱۴۴۳ھ
۶ / مارچ ۲۰۲۲ء

محمد طاہر سورتی
(دارالحمد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، گجرات)

● ● ●

ابتدائیہ

اس حقیر کو حرمین شریفین اور استنبول (ترکی) کے سفر کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، حرمین شریفین کا تقدس تو ظاہر ہے؛ لیکن استنبول کے سفر میں بھی یہی پہلو پیش نظر تھا؛ کیوں کہ ترکی نے آثارِ نبوی ﷺ کو جس محبت واحترام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے، اس کی جس قدر تحسین کی جائے کم ہے، واقعہ ہے کہ ان کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے اور سیرت نبوی ﷺ کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے، مگر ان کے علاوہ بھی مشرق ومغرب کے مختلف ملکوں میں جانے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا ہے، ان میں سب سے یادگار سفر ''ازبکستان'' کا تھا، جو قدیم اصطلاح کے مطابق ماوراء النہر کا علاقہ ہے، بڑے بڑے متکلمین، محدثین، مفسرین، فقہاء اور حکماء اسلام یہیں آسودۂ خواب ہیں۔

یہ سفرنامہ اسی سفر کی داستانِ محبت ہے، اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے محبی فی اللہ حضرت مولانا مفتی طاہر سورتی صاحب زید مجدہ کو کہ انھوں نے اس کی طباعت واشاعت کا انتظام فرمایا۔

خدا کرے یہ مختصر تحریر اپنے بزرگوں کی محبت میں اضافہ کا اور اسلامی تاریخ پر یقین جازم کا ذریعہ بنے، بہرحال اس سے جو بھی نفع ہو، مفتی صاحب اس کے اجر میں برابر کے شریک ہیں۔

یکم شعبان ۱۴۴۳ھ
۵/ مارچ ۲۰۲۲ء

خالد سیف اللہ رحمانی
(ناظم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

• • •

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علوم اسلامی کا کون طالب علم ہوگا جس نے بخاریٰ وسمرقند، ترمذ وخرتنگ، خوارزم اور ماوراء النہر کا نام نہ سنا ہو، اور حسین خوابوں کی اس سرزمین میں پہنچنے کا آرزومند نہ ہو، یہ سارے علاقے اس وقت روس کے استبداد سے آزاد ہونے والی وسط ایشیائی جمہوریتوں میں سے ایک ازبکستان میں واقع ہیں، روسی قبضہ کے زمانہ میں کوئی پرندہ بھی یہاں حکومت کے منشاء کے خلاف پر نہیں مار سکتا تھا، اور خاص کر مسلمانوں کا اور علماء کا تو یہاں پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، جب روس کا اقتدار ختم ہوا تو بحمد اللہ یہاں آمد ورفت کا راستہ کھلا۔

دراصل اس خطہ میں ترکی نسل سے تعلق رکھنے والی پانچ ریاستیں ہیں، جو ایک ہی نسل کی مختلف شاخوں کی آبادیاں ہیں: ازبکستان، قازقستان، کرغزستان، ترکمانستان، آذر بائیجان، یہاں جو زبانیں بولی جاتی ہیں، وہ بھی ترکی سے ملتی جلتی ہیں، اسی خطہ میں تاجکستان ہے، جہاں تاجک زبان بولی جاتی ہے، یہ فارسی سے قریب ہے، اور معلوم ہوا کہ نسلی اعتبار سے بھی وہاں کی بڑی آبادی فارسی النسل ہے، یہ ملک نہ صرف خود چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے؛ بلکہ جن ممالک کے درمیان ہے، وہ بھی ساحلِ سمندر سے محروم ہیں؛ لیکن قدیم زمانہ سے اس علاقہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے؛ کیوں کہ شاہراہ ریشم جو چین اور یورپ کے درمیان تجارت کا راستہ تھا، یہیں سے گزرتی تھی۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ علاقہ تین حکمرانوں میں منقسم تھا: خوارزم شاہ، چنگیز خان اور تیمور، قتیبہؒ بن مسلم نے (۸۷ھ — ۷۰۵ء ہیں) میں اس علاقہ کو فتح کیا اور بہ تدریج یہ خطہ دامن اسلام میں آ گیا، زار روس کے قبضہ سے پہلے یہ خطہ تین حصوں میں بٹا ہوا تھا: بخاریٰ، خوارزم، قہقان، تینوں ریاستوں میں حکومت مسلمانوں ہی کی تھی؛ لیکن الگ الگ

قبائل کی ، یہاں تک کہ ۱۸۶۰ء میں زار روس نے اِس پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا، زار نے بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھائے ؛ البتہ اس نے کمیونسٹوں کی طرح مذہب کے معاملہ میں دخل نہیں دیا، پھر جب روس میں کمیونسٹ اقتدار میں آئے تو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں اس پورے خطہ پر اپنا قبضہ جمالیا، ابتداء میں مزاحمت کی گئی ، اور بالخصوص علماء نے بڑی قربانیاں دیں ؛ لیکن آخر اس نے اس طرح شکنجہ کسا کہ مسلمانوں کو آہ کرنے کا بھی یارا نہ رہا، اُس وقت روس ہتھیاروں کی کثرت کے لحاظ سے پہلے نمبر پر تھا اور اس کی فوجی طاقت نا قابل تسخیر سمجھی جاتی تھی ، ان ملکوں کے لئے بہ ظاہر اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا ؛ مگر نا اُمیدی اور مایوسی کی اسی تیرہ وتاریک شب میں خدا کی غیبی طاقت کا نور طلوع ہوا، جو افغانستان سے اُٹھا اور اُس نے روس جیسی طاقت کی پھیلائی ہوئی ظلمت کو پاش پاش کردیا، آخر جب افغان مجاہدین نے اس سُپر طاقت کا غرور خاک میں ملادیا اور اس نے وہاں سے رختِ سفر باندھا تو بہت جلد وہ اِن ملکوں سے بھی واپسی پر مجبور ہوا، اور یہاں آزادی کا سورج طلوع ہوسکا، جیسے ہندوستان میں لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی ، یہاں ایسا نہیں ہوا ؛ بلکہ اس کا سبب یہ ہوا کہ افغانستان کی جنگ سے روس کو فوجیوں اور ہتھیاروں کا جو نقصان ہوا، وہ تو ہوا ہی ، معاشی اعتبار سے بھی اس کی کمر ٹوٹ گئی ، اور اس کی مثال اس دیو ہیکل درخت کی ہوگئی ، جو اپنے آپ سوکھ کر گر گیا ہو۔

روسی دور اقتدار میں یوں تو ہر طبقہ متأثر ہوا، کمیونزم کے غیر فطری نظام کی وجہ سے محنت کشوں کا جذبۂ محنت سرد پڑ گیا، صنعت کاروں میں جذبۂ مسابقت باقی نہیں رہا، اس کی وجہ سے معاشی ترقی رُک گئی ، حکومت کی پوری توجہ اس غیر فطری نظام کو تقویت پہنچانے کے لئے فوجی طاقت میں اضافہ پر مرکوز ہوگئی ، بین الاقوامی تجارت میں اس کا حصہ کم سے کم تر ہوتا گیا ؛ لیکن اس سے سب سے زیادہ مذہبی طبقہ اور جمہوریت پسند گروہ متأثر ہوا ؛ کیوں کہ کمیونزم کا خلاصہ یہی تھا کہ عوام دو کفِ جَو کے بدلے ، اپنا ضمیر ، اپنا عقیدہ ، اپنی رائے اور اپنی زبان کو فروخت کردیں ، ازبکستان میں مردم شماری کے مطابق یوں تو مختلف مذاہب سے

تعلق رکھنے والے لوگ ہیں ؛ لیکن ان کی تعداد بہت مختصر ہے ، اور روس کی مذہب دشمن حکومت کے مقابلہ ان کی طرف سے کوئی مزاحمت بھی نہیں ہوئی ، جو کچھ ہوئی مسلمانوں کی طرف سے ہوئی ؛ اس لئے مسلمانوں کی مذہبی شناخت مٹانے کی زیادہ کوشش کی گئی ۔

اکابرِ محدثین وفقہاء سے منسوب اس پورے خطہ میں مدارس کی کثرت تھی ، اور یہ درسگاہیں طالبان علوم نبوت سے معمور تھیں ؛ لیکن سارے مدارس بند کر دیئے گئے ، بعض دوسرے کاموں کے لئے استعمال ہونے لگے ، اور بعض منہدم کر دیئے گئے ، پورے ملک میں صرف ایک مدرسہ ''میر عرب'' باقی رکھا گیا ، اور اس میں بھی اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کو پڑھنے سے منع کر دیا گیا ، تاشقند جیسے بڑے شہر میں صرف دو مسجدوں میں نماز کی اجازت دی گئی ، وہ بھی صرف بوڑھے لوگوں کو ، مسجدیں یا تو میوزیم اور مارکیٹ میں تبدیل کر دی گئیں ، یا زمیں بوس کر دی گئیں ، پردہ پر سخت پابندی عائد کر دی گئی ، نہ قرآن مجید رکھنے کی اجازت تھی ، نہ اسلام پر کوئی کتاب طبع کرنے کی ، لوگوں کے پاس جو قدیم کتابیں تھیں ، وہ ان کو چھپا چھپا کر رکھتے تھے ۔

اس خطہ میں فارسی رسم الخط کا استعمال ہوتا تھا ، ۱۹۲۵ء میں جبراً اس کو روسی رسم الخط میں تبدیل کر دیا گیا ، پورے ملک میں کثرت سے محدثین ، متکلمین ، فقہاء اور صوفیاء کی قبریں ہیں ، بہت سے مزارات بھی منہدم کر دیئے گئے ، اسکولوں میں کوئی دینی تعلیم نہیں دی جاسکتی تھی ؛ البتہ '' آداب نامہ '' کے نام سے ایک مضمون شامل تھا ، جس میں عمومی اخلاقیات کی تعلیم ہوتی تھی ، روسی بڑی تعداد میں یہاں بسائے گئے ، مسلمانوں سے ان کے ازدواجی رشتے بھی قائم ہوئے ؛ بلکہ روسی عورت سے نکاح کو قابلِ افتخار سمجھا جاتا تھا ، کمیونزم کے خلاف مزاحمت یا اسلام سے تعلق کی بناء پر جو لوگ شہید کئے گئے ، وہ اتنے زیادہ تھے کہ ان کا کوئی شمار نہیں تھا ۔

اس ماحول میں یہاں علماء نے جان کی بازی لگا کر جس حُسن تدبیر سے اسلام کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا ، وہ تاریخِ دعوت وعزیمت کا ایک روشن باب ہے ، لوگوں کو اسلام پر

قائم رہنے کے لئے اپنی داڑھیاں منڈانا پڑیں، جوانوں کے لئے تو داڑھی کی اجازت بالکل نہ تھی، بوڑھوں کے لئے تھوڑی رعایت تھی، علماء نے حجروں کی خفیہ تعلیم کا نظام قائم کیا، زیر زمین حجرے بنائے جاتے، جو پہلے اس خطہ کی خانقاہوں میں ذاکرین کے لئے بنائے جاتے تھے، اس میں چھپ چھپا کر لوگ آتے اور قرآن مجید نیز اسلام کی بنیادی باتیں سیکھتے، بعض دفعہ پہلے حجرہ میں الماریوں میں شراب کی بوتلیں رکھی جاتیں؛ تاکہ پولیس پہنچے تو اسے شراب خانہ سمجھے، اور اندر کے حجرہ میں تعلیم دی جاتی، کبھی کھانے کی دعوت دی جاتی اور کھانے کے بہانے اپنے معتمد لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کی جاتیں، جاسوس اتنے زیادہ تھے کہ ہر لمحہ خطرہ محسوس کیا جاتا، بعض اوقات شوہر و بیوی یا باپ بیٹا دونوں مسلمان ہوتے؛ مگر ایک دوسرے سے اپنا مسلمان ہونا چھپاتے، خوف و ہراس اور ظلم و جور کی اس فضاء میں علماء و مشائخ نے لوگوں کے ایمان کی حفاظت کا سر و سامان کیا۔

۷۵ رسال کے طویل وقفہ میں ایسا لگتا تھا کہ اس سرزمین سے اسلام کا نام ونشان مٹ چکا ہوگا، مگر یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ جوں ہی روس کا جبری نظام ختم ہوا، مسلمانوں کے سینوں میں دبی ہوئی ایمان کی چنگاری پھر سے روشن ہوگئی، جو لوگ کمیونسٹ ہونے پر فخر کرتے تھے، یا تو خود انھوں نے کلمہ پڑھ لیا، یا ان کی نسلوں نے اشتراکیت کا طوق اپنی گردن سے اُتار پھینکا، نوجوان عمومی طور پر اسلام کے سایہ میں واپس آگئے، جو روسی اس خطہ میں آباد کئے گئے تھے، ان میں بیشتر تو واپس ہوگئے، اور جو رہ گئے، وہ زیادہ تر مسلمان ہوگئے، فضاء میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ جو اپنے آپ کو ملحد کہتے تھے، وہ بھی کم سے کم زبانی طور پر خود کو مسلمان کہنے لگے۔

روس سے آزادی کے بعد ازبکستان کے پہلے صدر اسلام کریموف ہوئے، اگرچہ اسلام کی طرف ان کا زیادہ جھکاؤ نہیں تھا؛ لیکن ان کے دور میں سختیاں کچھ کم ہوگئیں، بہت سی مسجدیں بحال کی گئیں، مائک میں اذان کی اجازت ملی، ان کے بعد موجودہ صدر شوکت ضیائیف صدر منتخب ہوئے، ان کے عہد میں کافی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں، بہت سی مسجدیں

آباد ہوئی ہیں، بعض مسجدیں اور مقابر جو منہدم کر دیئے گئے تھے، موجودہ حکومت نے دوبارہ پہلے ڈیزائن پر ہی ان کو تعمیر کرایا ہے، عوام کو خود مختار مدارس قائم کرنے کی اجازت تو نہیں ہے؛ لیکن حکومت کے زیر نگرانی اس وقت ملک بھر میں ۱۱ر مدارس چل رہے ہیں، جن میں تین وہاں کی اصطلاح میں ''عالیہ'' ہیں، یعنی وہاں سے طلبہ فارغ ہوتے ہیں، موجودہ فرمانروا کے اس طرز عمل سے عوام بہت خوش ہیں، اس خطہ میں آکر سب سے زیادہ جس چیز نے شادکام کیا، وہ یہ کہ ماشاء اللہ ہر نماز میں مسجدیں آباد رہتی ہیں، اور بڑی حد تک نمازیوں سے پُر رہتی ہیں، نیز ممانعت کے باوجود ان میں غالب تعداد نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

اِس وقت ملک کا دستور سیکولرزم پر مبنی ہے، یعنی حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے؛ لیکن عوام کے لئے ذاتی زندگی میں ایک حد تک مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے، یکم ستمبر کو اس کا ''یوم استقلال'' قرار دیا گیا ہے، یعنی قومی دن کو یوم آزادی کی بجائے ''یوم خود مختاری'' کا نام دیا گیا ہے، ملک کا دستور زیادہ تر روس کے دستور سے ماخوذ ہے، یہاں بحیثیت مجموعی ۱۹ر مذاہب کے ماننے والے لوگ ہیں؛ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، ۳ر کروڑ ۳۰ر لاکھ کی آبادی میں ۹۶ر فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں، سرکاری زبان اُزبک ہے؛ لیکن روسی زبان بھی کثرت سے بولی جاتی ہے، شہروں میں لوگوں کا معیار زندگی کافی اچھا ہے؛ لیکن دیہاتوں میں کافی غربت ہے، جہاں بہت سے مٹی کے کچے مکانات نظر آتے ہیں، روس نے یہاں کھیتوں کی سینچائی کا اچھا نظام بنایا ہے، اور زیادہ سے زیادہ زرعی اراضی تک پانی پہنچانے کی کوشش کی ہے، زمین میں کھلی نالیوں کے بجائے زمین کی سطح سے تقریباً دو فٹ اوپر اوپر پائپ کے ذریعہ نالیاں بنائی گئی ہیں، اور ان کو کھیتوں تک پہنچایا گیا ہے، شاید پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے، سیرابی کا بنیادی ذریعہ دو دریا ہیں، ایک: دریائے آمور، جس کا پرانا نام دریائے جیحون ہے، دوسرا: دریائے سیحون، ملک کو کئی قدرتی وسائل بھی حاصل ہے، جن میں سونا، چاندی، نیچرل گیس، ہائیڈروجن گیس اور ملک کی ضرورت کے بقدر پٹرول اہم ہیں، کاٹن کی پیداوار کے اعتبار سے یہ دنیا کے چند گنے

چنے ملکوں میں ہے؛ اسی لئے یہاں ٹیکسٹائل اور قالین کی صنعت کافی ترقی یافتہ ہے، لوگوں کا معیار زندگی تو بہت اچھا ہے؛ لیکن یہاں کی کرنسی جو ''سوم'' کہلاتی ہے، کی قیمت بہت ہی کم ہے، 9500 سوم ایک امریکی ڈالر کے برابر ہے، روس نے اس ملک کو جو فائدہ پہنچایا ہے، ان میں یہ ہے کہ سڑکیں کشادہ اور بہتر ہیں، لائٹ کا بہت اچھا نظم ہے، اور ملک کے ہر شہری کو ذاتی مکان حاصل ہے۔

اس ملک کی علمی تاریخ کی وجہ سے یہاں حاضری کی خواہش تو بہت عرصہ سے تھی؛ لیکن کچھ دنوں پہلے گجرات کے سفر میں دارالعلوم کھروڑ کے استاذ محب عزیز مولانا محمد ارشد صاحب سے ملاقات ہوگئی، اور کسی مناسبت سے بخاریٰ وسمرقند کا ذکر آگیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس ملک کا سفر کر چکے ہیں، میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اگر رمضان المبارک کے بعد سفر کی کوئی صورت بنتی ہو تو میں بھی شریکِ سفر ہونا چاہوں گا، اسی دن اتفاق سے گفتگو میں ان ہی کے ہم نام عزیز مکرم مولانا محمد ارشد فلاحی سلمہ (استاذ فلاح دارین ترکیسر) بھی شامل ہوگئے، جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے ابتدائی دور کے فضلاء میں ہیں، اور انھوں نے کہا کہ اگر آپ کا سفر ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گا، اور آپ کی خدمت کروں گا؛ البتہ مدرسہ کی ضرورت کے لحاظ سے ان کی رائے ہوئی کہ رمضان المبارک سے پہلے ہی یہ سفر ہو جائے، میں نے بھی حامی بھر لی، ازبکستان کی راجدھانی تاشقند میں ایک نوجوان فاضل مولانا عبدالقیوم صاحب ہیں، جن سے گذشتہ سفر میں مولانا ارشد کھروڑ کی ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے جب ان سے میرے ارادہ کے بارے میں بتایا تو بہت خوش ہوئے، انھوں نے اس حقیر کی کتاب ''حدیث اور فقہ حنفی'' کا ازبک زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، انھوں نے نہ صرف میری آمد پر اصرار کیا؛ بلکہ پورے سفر کے اخراجات اور انتظامات بہت ہی اصرار کے ساتھ اپنے ذمہ لے لیا۔

بالآخر ۱۰/ مارچ ۲۰۲۰ء کو راقم الحروف اور ارشدین عزیزین کا سہ نفری قافلہ ممبئی سے ازبکستان ایئر لائنز کے ذریعہ تاشقند کے لئے روانہ ہوگیا، ساڑھے تین گھنٹہ میں ہم لوگ

تاشقند پہنچ گئے، تاشقند سے ۲۲۲ رکیلومیٹر پہلے برف کی دبیز چادروں سے ڈھکا ہوا پہاڑی سلسلہ نظر آیا، جو بڑا خوبصورت منظر تھا، ہم لوگ ائیر پورٹ سے اُترے تو محب عزیز مولانا عبدالقیوم اپنے رفقاء کے ساتھ ائیر پورٹ پر موجود تھے، میزبان کی خواہش پر میں نے اپنی کچھ کتابیں ساتھ رکھ لی تھیں، اور مولانا ارشد کھروڈ نے مولانا عبدالقیوم کے آرڈر پر ان کے لئے کچھ کتابیں خریدی تھیں، دونوں ملا کر اچھی خاصی مقدار ہوگئی، کتابوں کے سلسلہ میں ایئرپورٹ کے عملہ کو کافی تأمل تھا؛ لیکن وضاحت کے بعد مسئلہ حل ہوگیا، اندازہ ہوا کہ مذہبی کتابوں کے سلسلہ میں ابھی بھی ان ملکوں کا رویہ کافی سخت یا محتاط ہے، ابھی صبح کا دس گیارہ ہی بجا تھا، ہم لوگ ہوٹل لے جائے گئے، وہیں ناشتہ کیا اور کچھ دیر آرام کے بعد شہر کے لئے نکلے، تاشقند وہی شہر ہے جو قدیم دور میں ''شاش'' کہلاتا تھا، شاش کے معنی ترکی زبان میں پتھر اور چٹان کے ہیں، اور ''قند'' کے معنی شہر کے ہیں، بعد کو یہ تاشقند کے نام سے معروف ہوگیا۔

تاشقند کی ایک شام

نظام یہ طے ہوا کہ بخاریٰ وسمرقند اور ترمذ کے بعد تاشقند کی سیر کی جائے؛ لیکن آج جو وقت بچا ہوا تھا، یہ بھی استعمال میں آجائے؛ اس لئے ہم لوگ یہاں کی ایک قدیم درسگاہ مدرسہ کوکل داش جس کو آج کل ''گوگل داس'' کہا جاتا ہے، کی زیارت کے لئے پہنچے، اس کا شمار یہاں کے مدارس عالیہ میں ہوتا ہے، یہاں دوسو طلبہ زیر تعلیم ہیں، مدرسہ کے اندر جانے کا موقع نہیں ملا؛ کیوں کہ کسی بیرونی مہمان کو مدرسہ کے اندر جانے اور طلبہ سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس مدرسہ کی تعمیر عبداللہ خان کے زمانہ اقتدار میں ہوئی، ۱۵۵۷ء سے ۱۵۹۸ء تک ان کی حکومت تھی، یہ ۱۶۰ رکمروں پر مشتمل ہے، اور ۱۹۹۲ء میں اس کو ورلڈ ہیری ٹیج میں شامل کرلیا گیا ہے، اس مدرسہ کے سامنے ''مسجد کلاں'' ہے، یہ بڑی وسیع مسجد ہے، ہم لوگوں نے اسی میں مغرب کی نماز ادا کی، اسی کے قریب ''شور بازار'' ہے، جو یہاں کا قدیم اور وسیع مارکٹ ہے، ہر سامان کا الگ الگ حصہ ہے، ہر حصہ میں صرف اسی کی دکانیں ہیں، سفر کے آخری دنوں میں ہم لوگ اِس بازار میں بھی گئے، عصر کے بعد ہم

لوگ تاشقند کے نئے شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے لئے کار سے نکلے اور کافی دیر چلتے رہے، یہاں عام طور پر عمارتیں زیادہ اونچی نہیں ہیں اور یورپ کے انداز پر چھپر نما صورت میں بنی ہوئی ہیں؛ کیوں کہ ٹھنڈ کے موسم میں کافی برف باری ہوتی ہے، یہاں سڑکوں کو روشنی سے سجانے اور قمقموں کے جھالر لگانے کا بڑا رواج ہے، اور چوں کہ نیروز کا تہذیبی تہوار بھی قریب تھا؛ اس لئے لوگوں نے زیادہ اہتمام سے شہر کو سجا رکھا تھا، یہ بڑا خوبصورت منظر تھا، ایسا لگتا تھا کہ روشنی کی بارش ہو رہی ہے، مغرب بعد ہم لوگ مولانا اکرام صاحب کے یہاں واپس آئے، جو آج عشائیہ کے میزبان تھے، اکرام صاحب کے والد کا نام مولانا عبداللطیف خان تھا، جو ایک عالم تھے، ازبک زبان میں فارسی قواعد پر ان کی ایک کتاب بھی ہے، جو مدارس میں پڑھائی جاتی تھی، وہ خود بھی ایک مدرسہ عالیہ سے فارغ ہیں، یہاں کھانے پر مولانا حکمت اللہ صاحب بھی آ گئے، جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے شاگرد ہیں اور اچھی اُردو بولتے ہیں۔

امام بخاریؒ کے قدموں میں!

۱۱/ مارچ کو ہم لوگ صبح ساڑھے سات بجے تاشقند سے روانہ ہوئے، اب ہماری منزل سمرقند تھی، سمرقند پہنچنے سے کچھ پہلے وہ مشہور جگہ ہے، جس کا ذکر خرتنگ کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں آیا ہے، اب یہ سمرقند کا حصہ بن چکا ہے، امام بخاریؒ جب اہل بخاریٰ کی ناقدری کی وجہ سے بخاریٰ سے نکلے تو سمرقند کی طرف بڑھے، اور خرتنگ کے مقام پر ان کی وفات ہوگئی، یہیں امام بخاریؒ کی قبر ہے۔

یہ بھی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ناخوشگوار واقعہ ہے کہ بہت سے اہل علم کی نہ صرف یہ کہ قدر و منزلت نہیں گئی؛ بلکہ ان کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی گئی، امام بخاری بھی انھیں لوگوں میں تھے، یہاں تک کہ ان کو اپنے شہر میں قبر کے لئے دو گز زمین بھی نہیں مل پائی، یہ علماء اسلام کی استقامت کی ایک مثال بھی ہے کہ انھوں نے حکومت کے عتاب کا شکار ہونا تو گوارہ کیا اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی راہ میں آبلہ پائی کو قبول کر لیا؛ لیکن دینِ حق کی تشریح

واشاعت میں ادنیٰ درجہ کی بھی مداہنت گوارا نہیں فرمائی، اور حکومتِ وقت کے سامنے سر نہ جھکایا، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پناہ رحمتیں نازل فرمائے، اور ہر دور کے اہلِ علم کو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عزیمت کا راستہ اختیار کرنے کی توفیق میسر ہو، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ امام بخاریؒ نسبی اعتبار سے نہ عرب تھے اور نہ ہاشمی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے حدیث کی ایسی خدمت لی کہ تمام عرب وعجم کی گردنیں ان کے سامنے خم ہیں، یہ اسلام کی آفاقیت اور اعجازی شان ہے کہ :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

امام بخاریؒ کی قبر پر ایک بہت ہی خوبصورت اور عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے، جو مرجعِ خلائق ہے؛ لیکن یہاں کے دوسرے مقبروں کی طرح یہاں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی کہ لوگ قبر پر آتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں، اور واپس چلے جاتے ہیں، قبر پر سجدہ کرنے، مرادیں مانگنے کا یا اپنی مرادوں کی پرچیاں باندھنے کا اس طرح کا رواج نہیں ہے، جو برصغیر میں ہے، ہم لوگ مزار کے حجرے کے اندر کچھ دیر بیٹھے، مولانا محمد ارشد فلاحی، مولانا محمد ارشد کھروڑ اور مولانا عبدالقیوم تاشقندی — سلمہم اللہ تعالیٰ — بھی موجود تھے، ان حضرات نے خواہش کی کہ صحیح بخاری کی چند احادیث پڑھ کر اِن حضرات کو خود امام بخاریؒ کی قبر کے پاس حدیث کی اجازت دی جائے؛ چنانچہ مولانا ارشد فلاحی نے بخاری کی ابتدائی حدیث پڑھی، مولانا ارشد کھروڑ اور مولانا عبدالقیوم نے آخری حدیث اور اس حقیر نے اول وآخر دونوں حدیثیں پڑھیں اور اِن حضرات کو اجازت دی، بالخصوص میری وہ سندیں جو حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کے واسطہ سے ہیں، اور جن میں اس حقیر کے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے درمیان صرف تین واسطے ہیں، کی اجازت دی گئی، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ سورتوں کی تلاوت کر کے امام بخاریؒ کے لئے دُعاء کی گئی، امام صاحبؒ کی ممنونیت کا احساس دل پر چھایا رہا، اور غیر معمولی مسرت ہوئی کہ بخاری شریف ہم لوگوں نے پڑھی، اللہ نے پڑھانے کی بھی توفیق عطا فرمائی؛ لیکن آج خود امام بخاریؒ کے قدموں میں

پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، امام بخاریؒ کی قبر کا احاطہ بہت وسیع ہے، حکومت نے سیاحتی نقطۂ نظر سے پورے احاطہ کی اور اس کی عمارتوں کی بہت تزئین کی ہے؛ اس لئے یہ شکوہ اور فنی نزاکت کا حسین امتزاج ہے۔

یہاں ''المعہد العالی لدراسات الحدیث النبوی امام بخاریؒ'' کی عمارت بھی حکومت نے بنائی ہے جو حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہے، وہاں بھی جانا ہوا، معہد عالی میں یہ چھٹی کا وقت تھا؛ لیکن اساتذہ کو جب اطلاع ملی تو انھوں نے پرتپاک استقبال کیا، ابھی طلبہ کی تعداد محدود ہے، صرف بارہ طلبہ رہتے ہیں، طلبہ بھی بڑی محبت وعقیدت کے ساتھ ملے، یہ معہد یہاں کے تین معاہد میں سے ایک ہے، اور حکومت کے زیر انتظام ہے، یہاں مولانا عبد القیوم نے راقم الحروف کی کچھ کتابیں لائبریری میں جمع کرائیں، ادارہ کا نصاب بھی دیکھا، نصاب اچھا ہے، میں نے مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلیؒ کی بعض کتابوں کا مشورہ دیا، معلوم ہوا کہ یہ پہلے سے شاملِ نصاب ہیں، حدیث کے علاوہ دوسرے علوم کی کچھ کتابیں بھی نصاب کا حصہ ہیں، اس نصاب کی ترتیب میں حکومت نے مختلف اہل علم کو دعوت دی تھی، جن میں عالم عرب سے شیخ یوسف القرضاوی کے علاوہ ہندوستان سے حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی (صدر شعبۂ حدیث دار العلوم دیوبند) اور پاکستان سے حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی بھی شامل تھے۔

اس احاطہ میں قرآن مجید کا میوزیم بھی ہے، جس میں دنیا بھر سے قرآن مجید کے نسخے جمع کئے گئے ہیں، یہ اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ جہاں لوگوں کو گھر میں قرآن رکھنے کی بھی ممانعت تھی، جن لوگوں کے پاس قرآن مجید تھا، وہ اس کے ایک ایک ورق کو تبرک کے طور پر چُھپا کر رکھا کرتے تھے، اور اگر برصغیر سے کوئی صاحبِ علم یا دیندار شخص پہنچتا تو ان سے کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی اور چیز نہ دیجئے، صرف قرآن مجید کا کوئی ورق ہو تو دے دیجئے، آج وہاں ماشاء اللہ قرآن مجید کے نسخوں کا میوزیم بنا ہوا ہے، لوگ آتے ہیں اور قرآن مجید کے مختلف نسخوں کی زیارت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ مستقبل میں اس سرزمین کا رشتہ ہمیشہ قرآن سے قائم رکھے اور اُس کو اس کی عظمت رفتہ واپس مل جائے۔

یہیں ایک صاحب کے یہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا، انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ ہمارے پورے قافلہ کے لئے پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا تھا، عصر کی نماز پڑھ کر ان کے یہاں سے ہم لوگ حضرت قُثَم ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی زیارت کے لئے گئے، یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، بہت بچپن میں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی تھی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو اپنے زمانۂ خلافت میں مدینہ کا گورنر بنادیا تھا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد وہ اِس طرف آ گئے، یہیں ان کی شہادت ہوئی، شاید اسی لئے ان کو یہاں ''شاہ زندہ'' کہا جاتا ہے، اہل سیر نے لکھا ہے کہ شکل وصورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھے، یہ قبر بہت اونچائی پر ہے، کافی سیڑھیاں چڑھ کر قبر تک پہنچنا ہوتا ہے، ہمارے دونوں احباب نے تو ہمت کی اور وہاں تک پہنچے؛ لیکن مجھے اونچائی کی وجہ سے ہمت نہیں ہوئی، میں نے نیچے ہی سے فاتحہ پڑھ لیا، ان حضرات نے بھی واپسی کے بعد بتایا کہ آپ کا ارادہ نہ کرنا ہی بہتر ہوا، بہرحال یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلام کی تعلیم واشاعت کے لئے صحابہؓ کہاں کہاں پہنچے؟ جب کہ اُس وقت موجودہ دور کے وسائل نہیں تھے، پھر بھی انھوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے ایسی جدوجہد کی کہ پوری دنیا تک اسلام کی روشنی پہنچادی۔

سمرقند میں ایک دن

سمر کے معنی ازبکی زبان میں قلعہ کے اور قند کے معنی زمین اور شہر کے ہیں؛ چوں کہ اس شہر میں کثرت سے قلعہ نما عمارتیں بنائی گئی ہیں، غالباً اسی لئے اس کو سمرقند کا نام دیا گیا، کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ یہ ''گھرک کند'' تھا، جس کے معنی ''نیلے شہر'' کے ہیں، شاید اسی لئے یہاں کثرت سے نیلے گنبد مختلف تعمیرات کا حصہ ہیں، مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اس شہر کے حسن وجمال کی تعریف کی ہے، یہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہے، یونیسکو کے ریکارڈ کے مطابق یہ 2750 سال قدیم شہر ہے، جس کا قدیم نام ''اسمارا'' تھا، قتیبہ بن مسلم باہلی نے

۸۷ھ مطابق ۷۰۵ء میں اس شہر کو فتح کیا، پھر اس کا قبضہ ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ سن ۹۲ھ میں فتح کیا، اس شہر کے لوگوں کے دامن اسلام میں آنے کی تاریخ بہت دلچسپ بھی ہے سرمایۂ عبرت بھی، جب قتیبہ نے اس شہر کو فتح کیا تو یہاں عیسائیت کا بول بالا تھا، جو شہر کا سب سے بڑا کاہن تھا، اس نے قاضی شہر کے پاس قتیبہ کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ اس کی فوج نے شہر کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے؛ لیکن نہ ہمیں اسلام کی دعوت دی گئی اور نہ ہمیں غور کرنے کی مہلت دی گئی، قاضی نے جب قتیبہ سے جواب طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ جنگ تو چالبازی کا نام ہے، یہ تو بڑا شہر ہے، اس کے قرب وجوار میں جو شہر ہیں، وہ مقابلہ ہی پر اڑے رہے، نہ مسلمان ہونا قبول کیا، اور نہ جزیہ دینا؛ اس لئے مجھے ان کے اسلام قبول کرنے کی اُمید نہیں تھی، قاضی نے پوچھا: کیا تم نے ان کو اسلام یا جزیہ کی دعوت دی تھی؟ قتیبہ نے کہا: نہیں، قاضی صاحب نے کہا: پھر تو تم نے مدعی کے دعویٰ کا اقرار کر لیا، قاضی نے قتیبہ سے کہا: اللہ نے اس اُمت کی انصاف قائم کرنے اور دھوکہ سے بچنے کی وجہ سے مدد کی ہے: ’’ما نصر الله هذه الامة إلا للدين و إقامة العدل‘‘ چنانچہ مدعی کے حق میں فیصلہ ہوا کہ تمام مسلمان چاہے وہ سرکاری افسر ہوں یا فوجی، مرد ہوں، عورتیں ہوں یا بچے، سب کے سب شہر خالی کر دیں، دوکانات ومکانات کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں، اور سمرقند میں کوئی مسلمان نہ رہے، کاہنوں کے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی؛ مگر اس کا اعلان کر دیا گیا اور رات ہونے سے پہلے پہلے سارے لوگ شہر سے باہر نکل گئے۔

سورج ڈوبنے کے بعد سمرقند کے ویران راستوں پر کتے بھونکنے لگے، اور مسلمانوں جیسی رحم دل قوم کے شہر سے چلے جانے پر لوگوں کو اتنا صدمہ ہوا کہ ہر گھر سے آہ وبکا کی آوازیں آنے لگیں، یہاں تک کہ کاہنوں کا گروہ بھی اس کو گوارہ نہ کر سکا، اور سمرقند کے لوگ فوج در فوج اس حال میں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی کی طرف بڑھے کہ بڑا کاہن آگے آگے تھا اور لوگوں کا جم غفیر پیچھے پیچھے، سب کی زبانوں پر کلمۂ شہادت تھا، شاید ہی تاریخ میں ایسی مثال ملے کہ فاتح کے اخلاق سے متأثر ہو کر مقدمہ اپنے حق میں فیصل ہونے کے باوجود ایک پوری

قوم نے فاتح گروہ کا مذہب قبول کرلیا ہو، افسوس کہ مسلمان فاتحین نے اس بات پر کم توجہ دی کہ زمینیں تو فولادی تلوار سے فتح کی جاتی ہیں؛ لیکن دل ودماغ اخلاق کی تلوار سے فتح کئے جاتے ہیں۔

یوں تو سمرقند اپنے موسم اور قدرتی حُسن کی وجہ سے ہمیشہ ہی حکمرانوں کا مرکز توجہ رہا ہے؛ لیکن جب تیمور نے اس شہر کو اپنی وسیع وعریض سلطنت کا دارالخلافہ بنادیا تو اس کے بعد اس کی رونق کو چار چاند لگ گئے، پُرشکوہ خوبصورت تعمیرات بھی ہوئیں، تیمور نے دُور دُور سے صنعت کاروں اور فنی ماہرین کو بھی یہاں لاکر بسایا، ان کی مدد سے بہترین عمارتیں بھی بنائی گئیں اور قالین سازی اور بعض دوسری صنعتوں کو بھی یہاں فروغ ہوا، ہندوستان کے مغل فاتح بابر کی پیدائش تو فرغانہ میں ہوئی؛ لیکن ایک درجہ میں اس کا تعلق بھی سمرقند سے تھا، اس کا نسب باپ کی طرف سے تیمور سے اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں سے ملتا تھا، وہ افغانستان سے گذر کر درۂ خیبر کی طرف سے ہندوستان پہنچا، اور یہاں ایسی مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی جو تقریباً چار سو سال قائم رہی۔

سمرقند میں بہت سے اہل علم گذرے ہیں، ان میں ایک ممتاز نام علامہ ابوبکر سمرقندیؒ کا بھی ہے، جن کی کتاب ''تحفۃ الفقہاء'' فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے؛ لیکن اُن کی قبر یہاں نہیں ہے، علم کلام کے ایک بڑے امام ابوالمنصور ماتریدیؒ (م: ۳۳۳ھ) ہیں، عام طور پر حنفیہ کے یہاں اعتقادات میں ان ہی کی اتباع کی جاتی ہے اور معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان ان کی رائے کو ایک معتدل رائے سمجھا جاتا ہے، ان کی نسبت سمرقند کے محلہ ''ماترید'' کی طرف ہے، ''مأخذ الشرع، تاویلات اہل السنہ اور شرح فقہ اکبر'' ان کی مشہور تالیفات ہیں، ان کی قبر یہیں واقع ہے، ہم لوگ وہاں پہنچے، ان کا مقبرہ بہت ہی خوبصورت ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کے گنبد کے اندرونی حصے میں سونے کے کام میں بیس پچیس کلو سونا استعمال کیا گیا تھا؛ لیکن روسیوں نے ان سب کو کھرچ کر نکال لیا، ابھی بھی چار پانچ کیلو سونا گنبد کی اندرونی سطح میں موجود ہے، اور نظر بھی آتا ہے، یہاں بھی فاتحہ پڑھنے کی توفیق ہوئی اور دُعاء کا اہتمام کیا گیا۔

اس کے بازو میں ایک قبرستان ہے، جو ''قبرستانِ محمد ین'' کہلاتا ہے، اس قبرستان میں ان لوگوں کو دفن کیا جاتا تھا، جو تفسیر وحدیث اور فقہ وکلام میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اور ان کا نام ''محمد'' تھا، کہا جاتا ہے کہ تقریباً چار سو ایسے اہل علم اس قبرستان میں مدفون ہیں؛ البتہ قبریں نمایاں نہیں ہیں اور نہ صاحب قبر کی شناخت موجود ہے، یہاں بھی حاضری اور ایصال ثواب کا موقع ملا، اس قبرستان سے باہر تھوڑے ہی فاصلے پر صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ (م: ۵۹۳ھ) کی قبر ہے، علامہ مرغینانیؒ کا نام چوں کہ محمد نہیں تھا؛ اس لئے اس قبرستان میں ان کو جگہ نہیں ملی؛ لیکن اس قبرستان کے باہر قریب ہی میں دفن کئے گئے، احاطہ سے باہر کہاں دفن کئے گئے؟ اس کی نشان دہی متعین طور پر موجود نہیں ہے؛ مگر تخمینہ کے طور پر ان سے منسوب ایک رمزی قبر بنا دی گئی ہے، بہر حال ایصال ثواب کے لئے خاص قبر کے پاس ہی کھڑا ہونا تو ضروری نہیں؛ چنانچہ ہم لوگوں نے وہیں سے دُعاء اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔

''سمرقند'' کا لفظ آتے ہی ایک اہم نام امام ابواللیث نصر بن محمد سمرقندیؒ (م: ۳۷۳ھ) کا ذہن میں آتا ہے، ان کا شمار بڑے فقہاء میں ہے، فقہائے احناف میں ان کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے، مسائل میں ان کی ترجیحات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، جدید اجتہادات پر ان کی مشہور کتاب ''نوازل ابواللیث سمرقندی'' ہے، ان کی تفسیر ''تفسیر السمرقندی'' بھی ایک بلند پایہ تفسیر شمار کی گئی ہے، یہ بھی سمرقند ہی میں مدفون ہیں، یہاں بھی ہم لوگوں کو پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور فاتحہ پڑھنے کا موقع ملا، ان کے مزار کا احاطہ بہت بڑا ہے، اور حکومت نے اس کو بہت ہی خوبصورت بنایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، یہیں ایک اور بزرگ خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرارؒ (م: ۸۹۵ھ) کی قبر بھی ہے، جو اپنے زمانہ کے بڑے نقشبندی بزرگ تھے، ملا عبدالرحمٰن جامیؒ بھی آپ کے خلفاء میں ہیں، یہاں بھی حاضری کا موقع ملا، حسبِ معمول دُعاء کی گئی، مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور ہم لوگوں کو معروف محدث علامہ دارمیؒ کی قبر پر بھی جانا تھا؛ اس لئے وہاں سے جلد روانہ ہونا پڑا، راستے

میں ''مسجد لائق'' کے نام سے ایک مسجد ملی، مغرب کی نماز یہاں ادا کی گئی، ہمارے میزبان نے اس مقام کے کسی ذمہ دار شخص سے ہم لوگوں کی آمد کا ذکر کر دیا تھا، وہ سارے لوگ انتظار میں چشم براہ تھے؛ حالاں کہ مغرب کا وقت شروع ہوئے کچھ دیر ہوگئی تھی؛ لیکن انھوں نے انتظار کیا اور جب ہم لوگ پہنچے تو نماز ہوئی، نماز کے بعد تمام حاضرین نے مصافحہ کیا اور خواہش کی کہ دُعاء کرائی جائے؛ چنانچہ اس حقیر نے دُعاء کرائی، حاضرین بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آئے، گویا برسوں کی ملاقات ہو، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

اس سے کچھ فاصلے پر مشہور محدث علامہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمیؒ (م:۲۵۵ھ) کی قبر ہے، یہ علاقہ دیہات کا ہے، رات کا اندھیرا اچھا خاصا ہو چکا تھا، ہم لوگ وہاں پہنچے، اور گاڑی کی روشنی جلا کر قبر کے قریب آئے، فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھے، علامہ دارمیؒ کا علم حدیث میں بڑا اونچا مقام ہے، امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ نے ان سے حدیث لی ہے، اور بعض لوگوں نے ان کی ''سنن'' (فقہی ترتیب پر حدیث کا مجموعہ) کو صحاحِ ستہ میں شامل کیا ہے؛ اس لئے یہاں آمد سے بڑی روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ سمرقند خوبصورت عمارتوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اور ہر عمارت اپنی جگہ فن تعمیر کا شاہکار ہے؛ چوں کہ امیر تیمور نے یہاں تعمیری کام ایرانی ماہرین سے کرایا تھا؛ اس لئے ڈیزائن کے اعتبار سے جیسے برصغیر میں دہلی، آگرہ اور لاہور کی مغلیہ عمارتوں کے درمیان مماثلت پائی جاتی ہے، اسی طرح یہاں کی عمارتیں بھی کثرت میں وحدت کا منظر پیش کرتی ہیں، یوں تو سمرقند میں بہت سی عالی شان مسجدیں ہیں اور ہر مسجد ایسی ہے کہ ''دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست''، لیکن ''مسجد بی بی خانم'' کو اپنی وسعت، طرزِ تعمیر اور خوبصورتی کے اعتبار سے نمایاں حیثیت حاصل ہے، یہ امیر تیمور کی سب سے بڑی بیوی ''بی بی خانم'' سے منسوب ہے، اس کے سامنے امیر تیمور کا بی بی خانم کے لئے بنوایا ہوا محل بھی ہے، یہ عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، الفاظ میں اس کا نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔

یہاں کی ایک بہت ہی مشہور اور تاریخی جگہ میدان ریگستان ہے، اسی کو بعض عرب مصنفین نے میدانِ داجستان لکھا ہے، آج کل اس کو ''ریگستان اسکوائر'' بھی کہتے ہیں، امیر تیمور اپنی فتوحات کے بعد اسی میدان میں اپنی فاتحانہ یادگاروں کی نمائش کرتا تھا، اس میدان کے ایک طرف شارع عام ہے، اور تین طرف تین مدارس کی عالی شان عمارتیں ہیں، دائیں جانب مدرسہ شیر دار ہے، جس میں معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ سلطنت بخاریٰ کے نائب امیر اور ازبک کمانڈر شیر دار نے تعمیر کرایا ہے، ۱۴۱۹ء میں اس کی تعمیر عمل میں آئی، بائیں جانب مدرسہ اُلغ بیگ ہے، جو ۱۴۱۷ء میں تعمیر ہوا، الغ بیگ تیمور کا پوتا تھا، اور اس کا شمار ماہرین فلکیات میں ہوتا تھا، اس نے اپنے ذوق کے مطابق ایک رسد گاہ بھی تعمیر کرائی تھی، جس کے نقشہ کا لاطینی ترجمہ آکسفورڈ سے شائع ہوا ہے، یہ مدرسہ اس نے سائنسی مضامین کی تعلیم کے لئے بنایا تھا، اس نے امتحان کے بعد ایک ایسے سادہ لباس درویش کو اس کی ذمہ داری سونپی، جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، اور پاؤں میں جوتا تک نہیں تھا؛ لیکن اس نے اُلغ بیگ جیسے ماہر فن کے سوالات کا بروقت جواب دیا، یہ درویش تھے: مولانا محمد حوافی، وہ زندگی بھر اس جامعہ کے امیر رہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ادوار میں کس طرح مسلمان علماء دینی وعصری علوم کا بہترین امتزاج ہوا کرتے تھے!

درمیان میں مدرسہ طِلا کاری ہے، اس کو بھی شیر دار خان نے ۱۶۴۶ء میں بنوایا تھا، مدرسہ کے اندر ایک مسجد ہے، جس کی اندرونی دیواروں اور چھت پر سونے کی نقاشی کی گئی ہے؛ اس لئے اس مسجد کو ''طلائی مسجد'' اور مدرسہ کو ''مدرسہ طِلا کاری'' کہا جاتا ہے، اس خطہ کے اکثر گنبدوں کی طرح اس مسجد کے اوپر بھی نیلے رنگ کا ایک بلند گنبد ہے اور دونوں طرف نیلے رنگ کی برجیاں بنی ہوئی ہیں، اس مدرسہ کو خاص طور پر علوم شرعیہ کی تعلیم کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، ان تینوں عمارتوں کے درمیان کھلا ہوا نہایت کشادہ صحن ہے، آج کل یہاں روشنی اور آواز پروگرام بھی پیش کیا جاتا ہے اور ملک کی قومی تقریبات اسی میدان میں منعقد کی جاتی ہیں، یہ تینوں عمارتیں اپنی شان وشوکت، بلندی اور دیواروں کے خوبصورت نقش ونگار کے اعتبار سے ایک سے ایک ہیں۔

میدانِ ریگستان سے متصل امیر تیمور کا مجسمہ ہے، جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہے، اس کے نیچے اس کی قبر ہے، وہ ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۵ء میں اس کی وفات ہوئی، ترک منگول کی برلاس شاخ سے اس کا تعلق تھا، ایک ہی زمانہ کے دو طاقت ور اور جابر حکمراں تیمور اور چنگیز کا جد امجد تومنہ خان تھا، تیمور نے اپنی زندگی میں ۴۲/ ملک فتح کئے، اس کی فتوحات کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۳۹۸ء میں وہ ہندوستان پہنچا اور دہلی میں قتل عام کرایا، اور ۱۳۹۹ء میں دمشق اور حلب کو فتح کیا، اس کی شجاعت جس قدر قابل تعریف ہے، اس کی خوں آشامی اسی قدر قابل مذمت، اور مسلمان اور حافظ قران ہونے کے باوجود اِس میں مسلم وغیر مسلم کا کوئی فرق نہیں تھا، یہ جنگ میں بہ یک وقت دونوں ہاتھ استعمال کرتا تھا، دائیں ہاتھ میں تلوار رکھتا تھا اور بائیں ہاتھ میں کلہاڑی، اور اس کے ساتھ ساتھ گھوڑے کی لگام بھی ہاتھ میں ہوتی تھی، ان مہمات میں زخم کھا کھا کر دایاں ہاتھ شل اور دائیں پاؤں میں لنگ ہو گیا؛ اسی لئے مخالفین اس کو ''تیمور لنگ'' کہتے تھے؛ لیکن ازبکستان میں اس کو ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے اور ''امیر تیمور'' کہا جاتا ہے۔

بہر حال آج کا پورا دن سمرقند کی سیر میں گزرا، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے پورا شہر دیکھ لیا؛ لیکن کچھ اہم اور یادگار عمارتیں ضرور دیکھ لیں، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ علمی دنیا پر جن محدثین اور فقہاء کا ایسا احسان ہے کہ اُمت کبھی اس سے سبک بار نہیں ہو سکتی، ان کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہیں ایک ریسٹورنٹ میں میز بانوں کی طرف سے ہم لوگوں کے لئے عشائیہ کا نظم تھا، جب ہم لوگ ہوٹل واپس آئے تو معہد امام بخاریؒ کے دو اساتذہ بھی ملاقات کے لئے آئے، جن میں ایک مولانا نظام الدین تھے، جو ہدایہ اور شرح معانی الآثار پڑھاتے ہیں، دوسرے مکتبہ کے ذمہ دار تھے، ماشاء اللہ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان حضرات کے اندر دیو بند کی بڑی محبت ہے، اور اس حقیر سے ان کی محبت ایک تو اس کی تالیفات کی وجہ سے ہے؛ لیکن ساتھ ہی ایک اہم سبب دیو بند کی نسبت بھی ہے۔

اس سفر میں ہم تینوں اور مولانا عبدالقیوم کے علاوہ ایک اہم ساتھی تاشقند کے ایک

تاجر جناب مظفر صاحب بھی تھے، ان ہی کی گاڑی تھی اور وہی ڈرائیونگ کر رہے تھے، ان کے علاوہ جناب احمد نقشبندی کے لڑکے عبدالرحمٰن حافظ اور ایک صالح نوجوان ''آبی جان'' بھی تھے، جو مولانا عبدالقیوم کے شاگرد ہیں اور حفظ کر رہے ہیں، جناب بختیار صاحب، جناب سعید اعظم صاحب، جناب فیض اللہ صاحب اور دیگر محبت کرنے والوں کا بھی ساتھ تھا، یہ سبھی تاشقند کے رہنے والے ہیں، سبھوں کے نام یاد نہیں رہے؛ لیکن یہ قافلہ تین گاڑیوں کا تھا، اللہ تعالیٰ ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے، اس طرح سمرقند کا سفر تمام ہوا۔

بخارا کی طرف

یہ رات ہم لوگوں نے سمرقند میں گذاری اور اگلی صبح بخارا کے لئے روانہ ہوئے، کہا جاتا ہے کہ ''بخر'' کے معنی مشرکانہ عبادت گاہ کے تھے، یہاں اس نام سے بودھوں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی، اسی مناسبت سے یہ شہر ''بخارا'' کہلایا، مگر یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ آج اس پورے خطہ کا تعارف اسلامی علوم کی خدمت سے ہے، بخارا کی شہرت تو امام بخاریؒ کی ذات والا صفات سے ہے؛ لیکن یہ شہر مختلف اکابر صوفیاء اور فقہاء کی بھی خوابگاہ ہے، بخارا پہنچنے سے پچاس کیلومیٹر پہلے شیخ عبدالخالق عجدوانیؒ کا مزار مبارک ہے، یہاں ہم لوگ اُترے اور فاتحہ پڑھا، کچھ وقت یہاں گذارا، پھر آگے بڑھے، شہر سے پانچ کیلومیٹر پہلے مشہور صاحب دل شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ کا مزار ہے، یہ ۷۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۹۱ھ میں وفات پائی، شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ہیں، تصوف کے سلاسل میں سے یہی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، ان کی قبر کی زیارت کا اور یہاں دُعاء کرنے کا موقع ملا، یہیں قریب میں ان کے استاذ اور شیخ کی قبر ہے، جو امیر کُلالؒ کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ کُلال کا لفظ ازبک زبان میں کلاں یعنی ''بڑے'' کے معنی میں ہے، یہ ان کا لقب تھا، وہاں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

اب کافی وقت ہو چکا تھا؛ اس لئے بخاریٰ شہر میں داخل ہونے کے بعد عصر سے پہلے

ایک ہوٹل میں تمام ساتھیوں کے ساتھ ظہرانہ کیا گیا، بخاریٰ کے قابل دید مقامات قدیم شہر میں ہیں؛ اس لئے ہمارے بعض رفقاء نے مولانا عبدالقیوم صاحب سے خواہش کی تھی کہ ہمیں قدیم شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھہرایا جائے؛ چنانچہ ''ہوٹل صفیہ'' کے نام سے ایک ہوٹل میں نظم ہوا، یہ قدیم شہر میں تھا اور اس کا گرد و پیش بھی اس کی قدامت کا گواہ تھا، چھوٹی گلیاں اور گلیوں میں مٹی کی کچی دیواریں؛ لیکن ہوٹل اندر سے تمام سہولتوں سے آراستہ تھا، یہیں ہم لوگوں نے آرام کیا، عصر کے وقت نکلے اور یہاں کی بڑی مسجد ''مسجد کبیر امام بخاریؒ'' میں عصر کی نماز ادا کی، پھر یہیں مغرب بھی ادا کی، کہا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ کا درس اسی مسجد میں ہوا کرتا تھا، یہ بہت ہی وسیع، کشادہ، خوبصورت، بلند دیوار اور منبر و محراب والی مسجد ہے، یہیں اس مسجد کے صحن کے بعد لگا ہوا مدرسہ ''مدرسہ میر عرب'' ہے، سعید بن عبداللہ یمنی کسی زمانہ میں بخاریٰ کے امیر تھے، ان کو ''میر عرب'' کہا جاتا تھا، انھوں نے اپنے زمانۂ حکومت (۱۵۳۰ھ تا ۱۵۳۶ھ) میں اس کی تعمیر کرائی تھی، روس کے تسلط تک یہ وسط ایشیا کے طلبہ کے لئے مرکز تھا، یہ ۱۶۰ ر کمروں پر مشتمل ہے، اب اس کو عالمی ورثہ میں شامل کیا گیا ہے، موجودہ حکومت نے اس مدرسہ کو گورنمنٹ کے زیر انتظام زندہ کیا ہے، اندر لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی؛ لیکن بعض طلبہ نے جن کو اطلاع ہوگئی، بہت ہی اشتیاق کے ساتھ ملاقات کے لئے نکل آئے۔

یہاں امام ابوحفص کبیرؒ جو براہ راست امام محمدؒ کے شاگرد ہیں اور جن کا شمار بڑے حنفی فقہاء میں ہے، کے مزار پر بھی حاضری کا اتفاق ہوا، ایک اور جگہ ''چہار ابوبکر'' کہلاتی ہے، اس عمارت میں چار قبریں ہیں، جن میں سے ہر ایک کا نام ابوبکر تھا اور یہ سب اصحاب علم تھے، یہاں بھی پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، فقہ حنفی کی معروف کتاب ''فتاویٰ خانیہ'' کے مصنف قاضی خان (م: ۵۹۲ھ) بھی یہیں آسودۂ خواب ہیں، وہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا، اور تھوڑا سا وقت وہاں گذارا گیا، قاضی خان کے مزار کی زیارت سے فارغ ہونے تک کافی دیر ہو چکی تھی، اس روز ہم لوگوں کے لئے عشائیہ کا نظم بخاریٰ کے ایک مخلص جناب شہروز صاحب کے یہاں

تھا؛ چنانچہ ہم لوگ وہاں آ گئے، وہیں عشاء کی نماز ادا کی، کھانا تناول کیا، تاشقند اور سمرقند کے احباب کا ایک بڑا قافلہ تو پہلے سے ساتھ تھا، اور بخاریٰ کے بھی بہت سے اہل علم اور مخلصین جمع ہو گئے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ میں کچھ خطاب کروں، میں نے اولاد کی تربیت کی اہمیت کے موضوع پر تقریباً ۵۰ منٹ خطاب کیا، اور عزیز مکرم مولانا عبدالقیوم صاحب نے اُزبک زبان میں ترجمہ کیا، میں نے اس موضوع کا اس لئے انتخاب کیا کہ یہ خطہ تقریباً پون صدی الحاد کے زیر سایہ رہا ہے، اور نوجوانوں کو دین سے دور کرنے کی منظم کوششیں کی جاتی رہی ہیں؛ اس لئے اب بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ نئی نسل کی تربیت پر توجہ دی جائے، حاضرین نے بڑی توجہ سے سنا اور بعد میں متعدد حضرات نے کہا کہ آپ نے جس موضوع پر ہمیں نصیحت کی، واقعی یہاں کے ماحول میں اس کی بہت زیادہ ضرورت تھی، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہلوایا، اس کو وہاں کے لوگوں کے لئے نافع بھی بنادیں۔

نَسف اور ترِمذ

بخاریٰ تاریخی اعتبار سے ایسا گلستانِ علم ہے، جس میں قدم قدم پر فکر ونظر کا شجرۂ طوبیٰ نظر آتا ہے، شمس الائمہ عبدالعزیز حلوانیؒ (م: ۱۰۵۶ھ) جیسا حنفی فقیہ، ابو یزید بسطامیؒ (م:۱۲۶۱ھ) جیسا درویش، ابوعلی سیناؒ (م: ۴۲۸ھ) جیسا سائنس داں اور محمد بن موسیٰ خوارزمیؒ جیسا فلکیات اور ریاضی کا ماہر اسی سرزمین میں پیدا ہوا، یہیں سے ان کا فیض جاری ہوا، مگر وقت نے اجازت نہیں دی کہ ان کی یادگاروں کی زیارت کی جائے؛ چنانچہ ۱۳؍ مارچ کی صبح ہم لوگ بخاریٰ سے ترمذ کی طرف روانہ ہوئے، بخاریٰ سے ترِمذ کا فاصلہ چھ سو کیلومیٹر سے بھی زیادہ ہے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالقیوم سلمہ کا مشورہ تھا کہ یہ سفر جہاز سے کرلیا جائے؛ لیکن پھر یہ بات سامنے آئی کہ ترمذ اور بخاریٰ کے درمیان نَسَف نامی شہر ہے، جس کو آج کل ''قرشی'' کہتے ہیں، اور نسف میں بڑے اہل علم گذرے ہیں، اگر کار سے جایا جائے اور ایک وقفہ نَسَف میں کرلیا جائے تو وہاں کے تاریخی مقامات کی بھی زیارت ہو جائے گی

اور تھوڑا آرام بھی ہو جائے گا؛ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا، ہم لوگ تقریباً دو پہر میں نسف پہنچے، یہاں امام ابومنصور ماتریدیؒ کے اجلہ تلامذہ میں سے ایک علامہ ابومعین نسفیؒ (م:۵۰۸ھ) کا مزار ہے، جن کی کتاب ''تفسیر الادلہ فی اُصول الدین'' معروف ہے، اس کے علاوہ اُصولِ فقہ اور علم کلام پر ان کی متعدد کتابیں ہیں؛ چنانچہ ہم لوگ اُن کے مزار پر گئے، پھر وہاں سے آگے بڑھے، جمعہ کا دن تھا، اور سرِ راہ ایک دیہات ''تلینگا آرام'' کی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی، یہ راستہ اتنا طویل تھا اور ہم لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ راستہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا، بہر حال چار بجے ترمذ سے متصل علاقہ شیر آباد پہنچنا ہوا، اسی شیر آباد میں امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ (م:۲۷۹ھ) کا مرقد ہے، یہاں حاضری ہوئی، فاتحہ پڑھا اور تھوڑی دیر توقف کیا، یہ بہت خوشی کا لمحہ تھا؛ کیوں کہ امام ترمذیؒ کی سنن کو برصغیر کے مدارس میں خاص اہمیت حاصل ہے، اس اہم کتاب کو پڑھنے کا بھی موقع ملا اور سالہا سال پڑھانے کا بھی، امام ترمذیؒ امام بخاریؒ کے مایہ ناز شاگرد تھے، جناب عبدالرحمٰن ترمذی کے یہاں ظہرانہ کا نظم تھا، وہیں جا کر تاخیر کے ساتھ ہم لوگوں نے دو پہر کا کھانا کھایا، یہاں وہ حجرہ بھی تھا، جس میں وہاں کی روایت کے مطابق قرآن مجید حفظ کرانے کا انتظام ہوتا تھا، اس کے بعد ہم لوگ ترمذ شہر میں داخل ہوئے اور وسط شہر میں افروز ہوٹل میں قیام کیا؛ چوں کہ بہت تھک گئے تھے؛ اس لئے اب باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اگلی صبح یعنی ۱۴/ مارچ کو پہلے ہم لوگ ''مرکز علمی امام ترمذیؒ'' حاضر ہوئے، یہ بھی حکومت کے زیر انتظام قائم ایک تعلیمی مرکز ہے، جس میں حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، عمارت بہت شاندار اور نو تعمیر شدہ ہے، ابھی طلبہ تین چار ہی ہیں؛ البتہ حکومت اس کو آئندہ وسعت دینا چاہتی ہے، یہاں بھی مولانا عبدالقیوم نے میری تالیفات لائبریری میں جمع کرائیں، یہاں ہم لوگ محمد بن علی حکیم ترمذی کے مزار پر بھی گئے، جو بڑے صوفی بھی تھے اور محدث بھی، جن کی کتاب ''نوادرالاصول'' حدیث کا بڑا اہم مجموعہ ہے، یہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ہیں، ان کا مزار شہر سے تین کیلومیٹر کے فاصلے پر دریائے جیجون کے کنارے

واقع ہے، بہت ہی پُرفضاء منظر ہے، گورنمنٹ نے یہاں بڑا پارک بنایا ہے، یہاں خانقاہی حجروں کو دیکھنے کا موقع ملا، زیرِزمین کئی حجرے بنے ہوئے تھے، میں نے تو اوپر سے دیکھا؛ لیکن دوسرے ساتھی سیڑھی سے اتر کر نیچے تک گئے، یہ اصل میں ذاکرین کے لئے بنائے گئے تھے کہ وہ ان حجروں میں چلہ کشی کرسکیں؛ لیکن کمیونسٹ دور میں یہی حجرے خفیہ طور پر بچوں کی تعلیم کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور حفظ قرآن کی اور دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی، یہاں سے نکل کر دریائے جیحون صاف نظر آتا ہے، کافی کشادہ دریا ہے، ازبکستان کی سیرابی ''دریائے جیحون اور دریائے سیحون'' ان ہی دو دریاؤں سے ہوتی ہے، اُن کے درمیان کے علاقے کو ''ماوراء النہر'' کہا جاتا تھا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترمذ کو پہلی بار حضرت عثمان بن عفانؓ کے صاحبزادے سعیدؒ نے صلح کے ذریعہ فتح کیا تھا؛ مگر بار بار کی شورش کی وجہ سے یہ علاقہ قبضہ میں آتا اور جاتا رہا، یہاں تک کہ ۹۳ھ میں قتیبہ بن مسلمؒ نے فتح کیا، دریائے جیحون سے متصل افغانستان ہے، وہاں سے افغانستان کی عمارتیں صاف نظر آتی ہیں، یہاں پر ایک قلعہ بھی ہے، جو فوج کی تحویل میں ہے، یہاں سے نکل کر ہم لوگوں نے گاڑی ہی سے سرسری طور پر شہر کی گشت کی، اور ائیر پورٹ پہنچ گئے، جہاں سے ہمیں تاشقند واپس ہونا تھا، اس بات سے خوشی ہوئی کہ ائیر پورٹ کا عملہ دینی نسبت کی بناء پر خصوصی ادب واحترام کے ساتھ پیش آیا، جو وہاں کے لوگوں کا مزاج ہے۔

سیرِ تاشقند

ترمذ سے تاشقند کا ہوائی سفر ایک گھنٹہ کا ہوتا ہے؛ چنانچہ ڈیڑھ بجے ہم لوگ تاشقند پہنچ گئے، اور سابقہ ہوٹل ''اورینٹل اِن'' پہنچ کر دن کا کھانا تناول کیا، ابھی تک ہم لوگوں نے تاشقند کے قابل دید مقامات میں سے ایک دو ہی کی زیارت کی تھی؛ اس لئے آج کا دن شہر کی سیر کے لئے رکھا گیا تھا؛ چنانچہ عصر کی نماز مسجد مینار میں پڑھی گئی، یہ بڑی خوبصورت مسجد ہے، اور اس کا مینارہ بھی بہت عظیم الشان ہے، جو غالباً ۴۳ رمیٹر اونچا ہے، اسی احاطہ میں امام ابوقفال شاشیؒ (۲۹۱-۳۶۵ھ) کے مزار پر جانے کی سعادت حاصل ہوئی، جو بڑے شافعی

عالم تھے اور اس خطہ میں ان ہی کے ذریعہ فقہ شافعی کی اشاعت ہوئی؛ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے، یہیں پر مدرسہ براق خاں کی عمارت بھی ہے، ازبکستان کی دوسری تاریخی عمارتوں کی طرح یہ بھی بہت خوبصورت اور پُرشکوہ ہے، افسوس کہ روسیوں کے عہد سے اس کا استعمال مارکٹ کے طور پر ہورہا ہے، اس کو شیبانیوں کے عہد حکومت میں نوردز احمد خان نے تعمیر کیا تھا، جو براق خاں سے مشہور تھا، یہیں وہ عمارت بھی ہے، جس میں بڑے اہتمام کے ساتھ ''مصحف عثمانی'' کو رکھا گیا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی کتابت کرا کر مختلف جگہوں کو بھیجا تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ خود ان کے زیر تلاوت تھا؛ اسی لئے بتایا جاتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے وقت جو خون (دھبہ) گرا تھا، اس کا نشان بھی اس مصحف پر موجود ہے، سرخ دھبہ تو ہم لوگوں نے بھی دیکھا؛ مگر اس دعویٰ میں کس حد تک صداقت ہے؟ معلوم نہیں، یہ مصحف دراصل امیر تیمور اپنے ساتھ تاشقند لایا تھا، روسیوں نے اس کو سینٹ پیٹرز برگ منتقل کردیا تھا، ۱۹۸۹ء میں یہ نسخہ ازبکستان کو واپس ملا، لوگ بڑی عقیدت سے اس کی زیارت کرتے ہیں۔

آج رات کے کھانے کا انتظام جناب اکرام صاحب کے یہاں تھا، ان کے بیٹے عزیزی الہام سلمہ ہمارے عزیز مکرم مولوی عبدالقیوم صاحب کے ساتھ ان کی مسجد میں نائب امام ہیں، مغرب کی نماز ہم لوگوں نے ان ہی کی مسجد میں ادا کی، ماشاء اللہ بہت وسیع، کشادہ اور خوبصورت مسجد ہے، کھانے کا بھی انھوں نے بہت اعلیٰ درجہ کا اہتمام کیا تھا، کھانے کے بعد دُعاء کی گئی، علمی مقامات اور مقدس شخصیات کی زیارت کا سلسلہ یہاں مکمل ہوا، تمنا تو ''فرغانہ'' جانے کی بھی تھی، جو صاحب ہدایہ کی جائے ولادت ہے، اسی کے ایک شہر ''اوش'' سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور فتاویٰ سراجیہ کے مصنف علامہ سراج الدین اوشیؒ کا تعلق ہے اور پہلا مغل حکمراں بابر بھی یہیں کا تھا، ازبکستان ہی میں ''خوارزم'' ہے، جس کو آج کل ''خیوہ'' کہا جاتا ہے، فقہ حنفی کی کتابوں میں بہت سی آراء علماء خوارزم کے حوالہ سے نقل کی

گئی ہیں، اور مختلف دینی اور سائنسی علوم کے ماہرین یہاں پیدا ہوئے ہیں؛ مگر یہ علاقے کافی دور تھے اور ہم لوگوں کے پاس وقت نہیں تھا؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس سفر نے تشنگی اور بڑھادی۔

ہمارے مقررہ نظام اور ہندوستان واپسی کے بنے ہوئے ٹکٹ کے لحاظ سے ۱۵/مارچ کی تاریخ قیام کا آخری دن تھا، ۱۶/مارچ کو ہماری واپسی تھی، ۱۵/مارچ کو میز بانوں نے ایک تفریحی پروگرام رکھا، وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کیلومیٹر پر ایک ایسی پہاڑی ہے، جس کی سطح بہت اونچی ہے اور جو برف سے ڈھکی رہتی ہے؛ چنانچہ ہم لوگ جناب نظام الدین صاحب تاشقندی کی گاڑی سے چلے، ان ہی کے گھر ناشتہ ہوا، اس سفر میں متعدد رفقاء کے علاوہ مولانا حکمت اللہ صاحب (فاضل دارالعلوم کراچی) اور مفتی عبدالمنان صاحب (فاضل دارالعلوم دیوبند) بھی ہمارے ساتھ تھے، ہم لوگ دوپہر کے قریب اپنی منزل مقصود پر پہنچے، اس جگہ کو ''کنوش کان'' کہا جاتا ہے، کنوش کے معنی ازبک زبان میں ''چاندی'' کے ہیں، بتایا گیا کہ اس پہاڑ سے چاندی کافی مقدار میں نکلتی ہے؛ اسی لئے اس کو کنوش کان کہتے ہیں، یہاں نظام الدین صاحب کا فارم ہاؤس بھی ہے، ہم لوگ وہیں ٹھہرائے گئے، کشمیر کا سا منظر ہے، ہرا بھرا علاقہ اور کسی قدر ٹھنڈ بھی، پھر ہم لوگ گاڑی سے برف پوش پہاڑی کی طرف لے جائے گئے، جس مقام تک گاڑی جاسکتی تھی، میں تو وہاں اُتر گیا، زیادہ تر رفقاء سفر بھی میرے ساتھ ہو گئے، عزیزان مولانا ارشدین اور بعض احباب سیڑھی کے ذریعہ اوپر اس مقام تک پہنچے، جہاں برف کی تہیں جمی ہوئی ہیں، وہاں تھوڑا سا وقت گذار کر پھر نظام الدین صاحب کے فارم ہاؤس پر واپسی ہوئی، یہیں ہم لوگوں نے کھانا تناول کیا، اگرچہ اجازت حدیث کی مجلس آج رات میں دوستوں نے رکھی تھی؛ لیکن جو علماء موجود تھے، ان کا خیال ہوا کہ انھیں یہیں حدیث کی اجازت دے دی جائے؛ چنانچہ میں نے ''مسلسل بالاولیۃ والی حدیث'' اور بخاری کی ایک حدیث پڑھ کر ان حضرات کو حدیث کی اجازت دی، اور یہاں سے تاشقند کے لئے روانہ ہو گئے۔

مغرب بعد مسعود خان صاحب جو حضرت مولانا قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم (الٰہ آباد) سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ہیں، اور مدینہ منورہ میں ان سے بیعت ہو چکے ہیں، کے یہاں عشائیہ کا نظم تھا، ان کے یہاں مختلف مساجد کے ائمہ، علماء اور حفاظ کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی، موقع کے لحاظ سے میرا خطاب بھی ہوا، میں نے عرض کیا کہ:
''قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کو گناہ کی دعوت دی گئی نبی تو یوں بھی معصوم ہوتا ہے؛ لیکن ان کو اس دعوت سے متأثر ہونے سے بچانے میں جو باتیں مؤثر ہوئیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے رب کی برہان دیکھ لی: ''لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ'' (یوسف: ۲۴) برہان رب سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں کئی باتیں کہی گئی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی شکل ان کے سامنے آگئی، اور نبی کی اولاد ہونے کی نسبت نے ان کی دستگیری کی، تو معلوم ہوا کہ دینی نسبت انسان کو دین پر قائم رکھنے اور گناہ سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، یہی نسبت آپ لوگوں کو حاصل ہے، اس سرزمین میں ایسے محدثین، فقہاء، صوفیا، اہل علم اور اہل دل پیدا ہوئے، جن کے نام سے آج دنیا کا چپہ چپہ گونج رہا ہے، آپ کی عزت نہ پٹرول سے ہے اور نہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی سے، آپ کا ملک نہ فوجی اعتبار سے سپر پاور ہے اور نہ معاشی اعتبار سے؛ لیکن دین کی نسبت نے آپ کو عزت دی ہے، اس نسبت کا خیال رکھئے، اور اس کو اگلی نسلوں تک پہنچایئے''۔

اس کے بعد حدیث کی اجازت دی گئی، مولانا حکمت اللہ صاحب نے میرے خطاب کا ازبک ترجمہ کیا اور اندازہ ہوا کہ انھوں نے ماشاء اللہ میری پوری بات حاضرین تک پہنچائی، مولانا مسعود خان خود بھی عالم ہیں، اور تاشقند میں قائم ''معہد عالی اسلامی اکیڈمی'' میں تاریخ کے استاذ ہیں، یہیں ہم لوگوں کو یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ جو فلائٹ ہندوستان آنے والی تھی، وہ کینسل ہوگئی ہے، اس کی وجہ سے طبیعت پر جو بوجھ ہوا ہوگا، وہ ظاہر ہے، بہر حال اب کوشش شروع ہوئی؛ لیکن ۲۱ / مارچ سے پہلے ہم لوگوں کی واپسی نہیں ہو پائی، اس

درمیان ایک تو عزیزی مولانا عبدالقیوم صاحب نے مجھ سے میرا رسالہ ''آسان اُصولِ فقہ'' سبقاً سبقاً جس قدر ہوسکا پڑھا؛ حالاں کہ خود ان کی اُردو اچھی ہے، اور وہ باصلاحیت عالم ہیں، مگر ان کی خواہش تھی کہ کچھ اسباق میں پڑھاؤں، اور پھر چوں کہ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا تو سورۂ جمعہ کے دوسرے رُکوع کا بھی درس دیا، ہمارے ہندوستان کے ساتھی بھی اس درس میں شامل ہوگئے۔

ہلال نشر میں حاضری

اس فرصت میں ہم لوگوں کو ایک اہم ادارہ کے معاینہ کا موقع مل گیا، جہاں اب تک جانا نہیں ہوا تھا، اور وہ ہے ''ہلال نشر'' اس کے بانی حضرت مولانا محمد صادق صاحبؒ تھے، یہ رابطہ عالم اسلامی کے بھی رکن تھے، انھوں نے ازبکستان میں اسلام کی اشاعت اور اس کی بقاء کے لئے بڑی خدمت انجام دی ہے، کمیونسٹوں کے دور میں کچھ عرصہ لیبیا میں اپنا وقت گذارا، جب یہاں سے کمیونسٹ اقتدار ختم ہوا تو واپس آئے، اور پوری توجہ ازبک زبان میں اسلامی لٹریچر کی تیاری پر مبذول کردی، ان کی ایک بہت تفصیلی تفسیر ازبک زبان میں ہے، حدیث کی شرح ہے، فقہ پر کتابیں ہیں، اصلاحی کتابیں بھی ہیں، ایک سو بیس کتابیں ان کے قلم سے منظر عام پر آچکی ہیں، اس وقت اس ادارے کے ذمہ دار اُن کے صاحبزادے مولانا اسماعیل صادق ہیں، جن کو عربی زبان پر اچھی قدرت حاصل ہے، اور ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں، ماشاء اللہ یہاں سے ہر ماہ قرآن مجید کے ۲۰؍ ہزار نسخے شائع ہوتے ہیں، اور وسط ایشیائی ممالک میں پہنچتے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے دینی موضوعات پر کتابیں شائع ہوئی ہیں، ازبکستان اور اس کے مضافات کے ممالک میں قرآن مجید اور اسلامی لٹریچر کے پہنچانے کا یہ سب سے اہم مرکز ہے، یہاں کی خدمات کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، اگلے دن اس مرکز سے نکلنے والے اخبار میں انھوں نے میری تصویر اور میری گفتگو کا خلاصہ بھی نقل کیا، میں نے ان کے والد ماجد مولانا صادق صاحبؒ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے تھے کہ ہمارے یہاں ''ایک آدمی'' ایک اکیڈمی کا کام کرتا ہے، تو آپ کے

والد صاحب کا کام بھی اسی زمرے میں شامل ہے، اس جملے کو انھوں نے خاص طور پر کوڈ کرتے ہوئے فیس بک پر نقل کیا، اور سوشل میڈیا میں اس کی کافی اشاعت ہوئی، بہر حال ان کی خدمات واقعی لائق تحسین ہیں، اللہ تعالیٰ ان ملکوں میں اسلام کی اشاعت کا سروسامان فرمائے، حکومت نے ان کی اعلیٰ خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی ہے، جس کے ڈیزائن میں قدامت اور جدت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

اسلامی معاہد کا نصابِ تعلیم

ہم لوگوں نے تاشقند، سمرقند، بخارا اور ترمذ ہر جگہ دینی تعلیم کے معاہد دیکھے، ان کے نصابِ تعلیم میں یکسانیت پائی جاتی ہے؛ کیوں کہ یہ سب سرکاری نظام کے تابع ہیں، ہر جگہ پانچ سالہ نصاب ہے، اور ہر سال میں دو سمسٹر (دورانیے) ہیں، گویا کُل دس سمسٹر میں تعلیم ہوتی ہے، اس میں قرآن کریم، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخِ اسلام کے علاوہ نحو، صرف اور فلسفہ ومنطق کے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں، نصابِ تعلیم کی بعض چیزیں ایسی ہیں، جن سے ہندوستان کے مدارس بھی استفادہ کر سکتے ہیں، جیسے: تجوید قرآن، تفسیر قرآن اور احکام قرآن، تینوں کو مستقل مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے، حدیث میں متون حدیث، شروح حدیث، احادیثِ احکام، اصطلاحات حدیث، تخریج حدیث اور اسناد کی تحقیق کی الگ الگ مضمون کی حیثیت سے تعلیم دی جاتی ہے، فقہ میں فقہ حنفی کی تعلیم ہوتی ہے، اور احادیث احکام کو بھی اسی نقطۂ نظر سے پڑھایا جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نصاب میں کئی کتابیں ہندوستان کے مصنفین کی ہیں؛ چنانچہ اُصولِ فقہ میں ملا جیونؒ کی ''نور الانوار'' اُصولِ حدیث میں مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ کی ''الرفع والتکمیل'' اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی ''فوائد فی علوم الحدیث'' نیز متون حدیث میں ان ہی کی ''اعلاء السنن'' شامل ہے، اس پانچ سالہ نصاب کی تکمیل پر گریجویشن کی سند دی جاتی ہے اور اس سند کی بنیاد پر طلبہ یونیورسٹی میں اسلامی وعربی علوم میں ماسٹر کر سکتے ہیں، اس سے

پہلے کے مرحلہ کی تعلیم سرکاری نصاب کے مطابق ہوتی ہے اور ہائی اسکول سطح کی تعلیم کے بعد اِن مَعاہد میں داخلہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر کے دینی مدارس میں جو نصاب اور تدریس کا جو اُسلوب مروج ہے، وہ بہت ہی مفید اور اہمیت کا حامل ہے، اس کے ذریعہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے سے علوم اسلامی کے تمام شعبوں میں قد آور شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی اس کا تسلسل قائم ہے؛ لیکن پوری دنیا اور خود ہمارے ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت ہے کہ اہل مدارس اپنے تعلیمی نصاب اور نظام پر نظر ثانی کریں، مدارس کے مقاصد اور اس کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا نصاب مرتب کریں، جو زمانہ کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو؛ تا کہ طلبہ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد جب باہر کی دنیا میں پہنچیں تو اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کریں اور احساس کمتری میں مبتلاء نہ ہوں، اس کی آسان اور بہتر شکل یہی ہے کہ موجودہ درسِ نظامی سے پہلے ثانویہ کا مرحلہ رکھا جائے، جس میں ہائی اسکول یعنی دسویں کلاس تک کے مضامین پڑھائے جائیں، اور مروجہ درس نظامی کے ابتدائی دو تین سالوں کے مضامین کو بھی اسی مرحلہ میں شامل کر لیا جائے، پھر مروجہ درس نظامی کا نصاب پانچ سالوں میں پڑھا دیا جائے، اس طرح بہت کم تبدیلی کے ساتھ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

اس پورے سفر میں ایک صالح نوجوان جو قدم قدم پر ساتھ رہے اور بڑی خدمت کی، وہ ہیں عزیز مکرم آبی جان سلمہ، وہ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے ساتھ خود اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں، ۱۸/ مارچ کو دوپہر میں انھوں نے ضیافت کا اہتمام کیا، جس میں مہمانوں کے ذوق کی رعایت کرتے ہوئے ہندوستانی طرز کے کھانے بنوائے، اسی دن رات میں جناب مظفر صاحب کے یہاں عشائیہ کی دعوت تھی، حاضرین کی خواہش تھی کہ میں کچھ عرض کروں؛ چوں کہ یہاں مجھ سے کثرت سے ایسے سوالات کئے گئے، جن کا تعلق سودی لین دین سے تھا، فقہ کی کتابوں میں بھی اس خطہ کے بعض ایسے مروجہ معاملات کا ذکر آیا ہے، جن میں سود کا شبہ پایا جاتا ہے، اس مناسبت سے میں نے یہاں رزق حلال کی اہمیت، سود کا

گناہ اور خود اس دنیا میں سود کے نقصانات پر روشنی ڈالی، بحمد اللہ لوگوں نے قبولیت کے جذبہ سے سنا اور کافی سوالات بھی کئے۔

۱۲/ مارچ کو ہم لوگوں کی ازبکستان ایئرلائنز سے واپسی ہوسکی، ہمارے ہوٹل ''اورینٹ اِن'' کے مالک کا نام جناب عبدالغفور تھا، وہ بھی چند دنوں کے قیام میں بہت مانوس ہوگئے، بڑی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے دُعاء کراتے، پانی پر دم کراتے، جو کرایہ مقرر تھا، اس میں بھی انھوں نے بلامطالبہ اپنی طرف سے کافی تخفیف کردی، اور ایک ترکی ریسٹورنٹ میں ہم لوگوں کی پُرتکلف دعوت بھی کی، جس وقت ہم لوگوں کو نکلنا تھا، اس دن ان کے یہاں شادی کی تقریب ہونے والی تھی، پھر بھی ملاقات کرنے کے لئے آئے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ پیش آیا کہ واٹس ایپ پر میری آمد کی اطلاع اور مختصر تعارف بعض مقامی احباب نے نشر کردیا تھا، انھوں نے بھی پڑھا، وہ ملاقات کے مشتاق تھے؛ مگر ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہم لوگ ان ہی کے ہوٹل میں مقیم ہیں، انھوں نے ملاقات کے لئے کسی سے دریافت کیا، اور بتایا گیا کہ میں ان ہی کے ہوٹل میں مقیم ہوں، تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، گفتگو کے دوران جب اذکار و اوراد کے سلسلہ میں ان کے یومیہ معمولات کا حال سنا تو مجھ کو اپنا معمول بہت حقیر نظر آیا، واقعی کیچڑ میں بھی لعل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

۲۱/ مارچ کی صبح کو ہم لوگوں کی ہندوستان واپسی تھی؛ چنانچہ ۲۰/ مارچ کی شب میں سید عظیم صاحب نے کھانے کا اہتمام کیا، جہاں بھی اس طرح کی دعوت ہوتی، شہر کی اہم دین پسند شخصیتوں کو یہ حضرات مدعو کرتے، یہاں بھی منتخب مجمع تھا، حاضرین کی خواہش تھی کہ کچھ دینی باتیں کہی جائیں، کمیونسٹوں کے دور میں یہاں جو گمراہیاں پھیلائی گئیں، ان میں ایک عورتوں کی بے قید آزادی بھی ہے؛ اگرچہ یہاں بے پردگی کا ماحول کم نظر آیا؛ لیکن فکری اعتبار سے مغرب کی آزاد خیالی کا اثر خواتین میں پایا جاتا ہے، اور خواتین کی دینی تعلیم وتربیت سے بے توجہی کا احساس ہوتا ہے، اس پس منظر میں عرض کیا گیا کہ اسلام کی دعوت اور اسلامی علوم کی اشاعت میں خواتین کا بڑا اہم کردار رہا ہے، اس سلسلہ میں صحابیات کی بعض مثالیں

بھی پیش کی گئیں اور وہاں کے موجودہ حالات میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے؟ اس پر روشنی ڈالی گئی۔

چند نقوش عبرت وموعظت

اس سفر میں جو چند قابل توجہ باتیں سامنے آئیں، ان کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، پہلی بات یہ ہے کہ اس پورے خطہ پر کمیونزم کے غلبہ کا جو دور گزرا ہے، اس میں نہ صرف مساجد ومدارس اور دینی مراکز کو تہس نہس کرنے یا وہاں سے انجام دی جانے والی دینی خدمات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی؛ بلکہ لوگوں کے دل ودماغ کو بدلنے کے لئے بھی پورا زور لگا دیا گیا، بے حیائی وفحاشی کو پھیلانے کی بھرپور کوشش کی گئی، نوجوانوں کو دین بیزاری کے انجکشن لگائے گئے، خواتین کو آزادیٔ نسواں کی دعوت دی گئی؛ لیکن جب روس کا اقتدار ختم ہوا تو بہت کم عرصہ میں الحاد ودہریت کو پسپا ہونا پڑا، اور پوری قوم پر اسلام کا رنگ چڑھ گیا؛ چنانچہ آج مسجدوں میں نوجوانوں کی بڑی تعداد نظر آتی ہے، داڑھی کی ممانعت کے باوجود داڑھی رکھنے کا جذبہ عام ہے، عورتیں عام طور پر ساتر لباس اور حجاب استعمال کرتی ہیں، دوسرے مسلمان ملکوں کے مقابلہ یہاں خواتین کے باپردہ لباس پہننے کا رواج زیادہ ہے؛ البتہ عمومی طور پر عورتیں چہرہ کھلا رکھتی ہیں، ہمارے ملک میں سڑکوں کے کنارے نیم عریاں تصویریں کثرت سے نظر آتی ہیں؛ لیکن یہاں ایسے اشتہارات نظر نہیں آتے، یہ ایک خوش آئند بات ہے اور اس سے اسلام کی روحانی طاقت، فکری سربلندی اور لوگوں کو متأثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، مسلمانوں میں عمل کی کوتاہی جس درجہ کی بھی ہو؛ لیکن ان کو اپنا ایمان عزیز ہوتا ہے، اللہ کرے یہاں دینی جذبہ کو اور فروغ ہو اور اس خطہ کی عظمت رفتہ واپس آسکے۔

یہاں جو ایک خاص بات دیکھنے میں آئی، وہ ہے دین، شعائرِ دین اور اہل دین کے لئے بے حد ادب اور جذبۂ توقیر، اپنے بزرگوں کی یادگاروں سے تو انہیں محبت ہے ہی؛ لیکن علماء ومشائخ سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، خیر کے کام میں خرچ کرنے کا جذبہ ہے،

اب جو مسجدیں تعمیر ہورہی ہیں، وہ عوامی تعاون سے ہورہی ہیں؛ لیکن یہ تعمیر بھی اسی دور کی یاد دلاتی ہے، جو یہاں کا سنہرا دور تھا، مساجد میں ایک امام کے ساتھ کئی کئی نائب امام ہوتے ہیں اور مؤذن اس کے علاوہ ہوتا ہے، ایک مسجد کے بارے میں استفسار پر معلوم ہوا کہ یہاں چار امام ہیں، دو مؤذنین ہیں اور مسجد کے خدام ان کے علاوہ ہیں، میں نے مزاحاً کہا کہ آپ نے ایک ہی مسجد میں ائمہ اربعہ کو جمع کر دیا ہے، خدام مسجد کی تنخواہیں عوام ہی کے اجتماعی تعاون سے ادا ہوتی ہیں، دینی خدمت گزاروں کی یافت دوسرے شعبوں کے ملازمین کے برابر تو نہیں ہوتی ہے؛ لیکن اتنا فرق بھی نہیں ہوتا ہے جو ہندوستان میں دین کے خادموں اور دوسرے شعبوں کے خدمت گاروں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

لوگوں میں خوش سلیقگی بھی دیکھنے کو ملی، صفائی ستھرائی کا بہت زیادہ اہتمام ہے، حکومت کا عملہ اس کام کو انجام دیتا ہے؛ لیکن عوام میں بھی اس کا پورا لحاظ ہے، مسجد اور اس کے طہارت خانے بھی صاف ستھرے نظر آتے ہیں، مسجدوں میں یہ بات بھی بہت اچھی محسوس ہوئی کہ لوگ سیڑھیوں کے باہر قطار میں لگا کر اپنے جوتے رکھتے ہیں، بے سلیقگی کے ساتھ جوتے نہیں رکھے جاتے، لوگوں کے تعمیری ذوق میں بھی بڑی نفاست ہے، اور گھر کا اندرونی حصہ بہت ہی آراستہ وپیراستہ ہوتا ہے، فرنیچر اور کھانے کے برتن وغیرہ سے بھی نفاست اور خوش ذوقی کا اظہار ہوتا ہے، ضیافت کا جذبہ غیر معمولی ہے، عام طور پر ان کے کھانوں میں دال اور سبزی کا گزر نہیں، خوب گوشت کھایا جاتا ہے، ترکی کی طرح یہاں بھی کباب کا خاص ذوق ہے، بڑے جانور کا بھی، بکرے کا بھی اور چکن بھی؛ بلکہ یہاں گھوڑے کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے، ہم لوگوں کے سامنے بھی رکھا گیا، میں نے عرض کیا: آپ حضرات کھا سکتے ہیں؛ کیوں کہ جمہور اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس لئے مکروہ ہے کہ اس سے آلۂ جہاد کی قلت پیدا ہوسکتی ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ اب اس دور میں گھوڑے کا استعمال جہاد کے لئے نہیں ہوتا؛ اس لئے کراہت کی وجہ باقی نہیں رہی؛ مگر آدمی جو چیز پہلے سے نہ کھاتا رہا ہو، اس کو کھانے میں طبعی کراہت ہوتی ہے؛ اس لئے میں اس سے بچ رہا ہوں،

بہر حال ازبکی حضرات جب کھانے پر مدعو کرتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اور عمدہ سے عمدہ کھلایا جائے، دین سے تعلق اور اللہ پر یقین کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ کثرت سے دُعاء کراتے ہیں، بار بار دُعاء کی درخواست کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اسی وقت دُعاء ہو جائے، خاص کر کسی کے گھر پہنچنے پر یا کھانے کے بعد خصوصی اہتمام سے دُعاء کرائی جاتی ہے، الحاد و دہریت کی یلغار کے باوجود ان حضرات کو دین پر جو ثابت قدمی حاصل رہی اور کمیونسٹوں کے جاتے ہی یہ اتنی جلد الحاد کے جال سے باہر نکل آئے، خیال ہوتا ہے کہ یہ ان کے دلوں میں دین کی عظمت اور اہل دین کے ادب کا نتیجہ ہے!

ایک سبق جو وہاں کی مساجد کے نظام سے لینے کا ہے، وہ یہ ہے کہ — جیسا کہ ذکر کیا گیا — وہاں ایک مسجد میں کئی کئی ائمہ ہوتے ہیں، جو ہیڈ امام ہوتا ہے وہ جمعہ کا خطبہ دیتا ہے، مؤذن بھی غالباً ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور مسجد کے خادمین ان کے علاوہ، طہارت خانوں کی صفائی ستھرائی کا بھی بہت معقول نظم ہوتا ہے، ہندوستان کی صورت حال یہ ہے کہ اِکا دُکا مسجدوں کو چھوڑ کر مسجد میں ایک ہی امام ہوتا ہے اور ایک ہی مؤذن، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسجد کی صفائی ستھرائی کی ذمہ داری بھی بعض جگہ مؤذن صاحب پر ہوتی ہے، یہ اس عہدہ کا اعزاز ہے، جس پر حضرت بلالؓ جیسے صحابی فائز تھے، اور جس کام کی حضرت عمرؓ جیسے خلیفۂ راشد تمنا کیا کرتے تھے؟؟ طہارت خانوں کی صفائی کا انتظام بھی اتنا ناقص ہوتا ہے کہ اکثر مسجدوں کے بیت الخلاء میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی، غور کیجئے، کیا یہی ہے مسجد کا احترام؟ جن مسجدوں کے پاس معاشی وسائل نہیں ہیں، ان کی صورت حال تو یہ ہے ہی، اور یہ ایک حد تک مجبوری بھی ہے؛ لیکن جن مساجد کے پاس معاشی وسائل موجود ہیں، ان کی انتظامیہ بھی ان کاموں پر خرچ کرنا نہیں چاہتی، یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے، ضرورت ہے کہ ہر مسجد میں امام اور مؤذن کو لے کر کم سے کم تین افراد رکھنے کی کوشش کی جائے اور تینوں میں اذان دینے اور بقدرِ ضرورت نماز پڑھانے کی صلاحیت ہو؛ تاکہ یہ حضرات بھی اپنی گھریلو ضروریات کے لئے نکل سکیں، ان کے لئے ہفتہ وار اور سالانہ چھٹیوں کی سہولت ہو، اگر اپنے

فرائض کو ادا کرتے ہوئے موقع ہو تو کوئی چھوٹی موٹی تجارت کرلیں، اسی طرح وضوء خانہ اور بیت الخلاء کی صفائی کے لئے نمازیوں کی تعداد کے اعتبار سے مناسب تعداد میں عملہ رکھا جائے، جھاڑو دینے اور صفائی کرنے کے لئے مسجد کی وسعت کے اعتبار سے علاحدہ عملہ ہو، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ان کاموں کے لئے جز وقتی ملازم رکھا جائے، اس پر توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے، مسجد کی تعمیر وتزئین پر اور آج کل قالینوں اور جائے نمازوں پر کافی پیسے خرچ کئے جاتے ہیں؛ لیکن مسجد کے اصل کاموں میں بخل سے کام لیا جاتا ہے۔

تاشقند میں ۲۱/ مارچ ۲۰۲۰ء کو ہم لوگ فجر کی نماز پڑھتے ہی ہوٹل سے باہر نکلے، مولانا عبدالقیوم تاشقندی سلمہ اور ان کے رفقاء ایئرپورٹ لے کر آئے، یہ ہم لوگوں کے لئے بہت خوشی کا موقع تھا، ایک تو اپنے ملک آنے کی خوشی، دوسرے: ازبکستان ایئر لائز نے اعلان کردیا تھا کہ اس کے بعد غیر معینہ مدت کے لئے دہلی اور ممبئی کی فلائٹ بند رہے گی، اگر خدا نخواستہ ہم لوگ اس فلائٹ سے نہ آسکتے تو یہ کس قدر پریشانی کا سبب ہوتا؟ وہ محتاج اظہار نہیں؛ اس لئے اس خوشی کے پیچھے یہ بات بھی کارفرما تھی کہ ایک بڑی آزمائش سے ہم لوگ بچ گئے، بظاہر طبیعت بالکل ٹھیک تھی، نہ نزلہ، نہ زکام، نہ کھانسی، نہ بخار؛ اس لئے ایک گونہ اطمینان تھا کہ ہمیں ائیرپورٹ سے اپنی منزل کی طرف جانے کی اجازت دے دی جائے گی؛ لیکن میرے دل کے ایک گوشہ میں تردد وتشویش کا کانٹا بھی چبھ رہا تھا کہ چوں کہ میں الرجی کا مریض ہوں، کہیں میڈیکل ٹیسٹ میں پکڑا اور روک نہ لیا جاؤں۔

تنہائی کے سایہ میں!

میری فلائٹ ساڑھے گیارہ بجے دن دہلی ائیرپورٹ پر پہنچ گئی، جب اُترے تو قیامت کا منظر تھا، ہزاروں مسافر ائیرپورٹ پر پڑے ہوئے تھے، جگہ کی کمی کی وجہ سے بہت سے لوگ زمین ہی پر بیٹھے اور لیٹے ہوئے نظر آئے، اللہ جزائے خیر دے دونوں رفقاء عزیزان گرامی مولانا محمد ارشد فلاحی اور مولانا محمد ارشد کھروڑ کو کہ اِن حضرات نے خود تکلیف اُٹھا کر مجھے راحت پہنچانے کی کوشش کی، حسبِ ضرورت پولیس سے بھی مدد لی، دوڑ

دُھوپ کر کرسی کا بھی انتظام کیا، مسافروں کے گروپ بنا بنا کر ہر دس آدمی پر پولیس کا ایک عملہ مقرر ہوا، اور اس نے سب کے پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لئے، مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد وہ مرحلہ تھا جہاں سرسری میڈیکل ٹیسٹ کیا جاتا تھا، اس میں رات کے تقریباً ۱۱ ربج گئے، میں نے دو کام خاص طور پر کئے، ایک تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ عشاء کی نماز ائیر پورٹ ہی پر ادا کر لی، دوسرے ایک سوٹ کیس میں وہ ضروری سامان رکھ لئے، جس کی ہر وقت ضرورت پیش آتی ہے؛ تاکہ اگر قرنطینہ میں ڈال دیا جائے تو دشواری نہ ہو، اور اسی سوٹ کیس کو اپنے ساتھ رکھ لوں۔

جب ہم لوگ میڈیکل ٹیسٹ کے ہال میں آئے تو جو لوگ جوان اور نوجوان تھے، ان کو تو عام طور پر چھوڑ دیا گیا، سوائے اس کے کہ کسی کو بخار اور کھانسی ہو، یا کورونا سے متأثر ملک سے آیا ہو؛ لیکن جتنے لوگوں کی عمریں ساٹھ سے اوپر تھیں، ان سبھوں کو احتیاطی نگہداشت (کورنٹائن) میں رکھنے کا فیصلہ ہوا، میں بھی اس زمرہ میں شامل تھا، مجھے اپنے آپ سے زیادہ دوسرے ایسے لوگوں پر رحم آرہا تھا، جو زیادہ پریشانی سے دو چار تھے، جیسے بعض سن رسیدہ خواتین، جو دوسرے ملکوں سے آئیں، انھیں بھی روک دیا گیا، شوہر و بیوی آئے، دونوں کے لئے کورنٹائن کا فیصلہ ہوا، اور کہا گیا کہ آپ کو الگ الگ رہنا ہوگا، اللہ جزائے خیر دے عزیزی مولانا ارشد کھروڑ کو کہ انھوں نے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں؛ لیکن میں نے ان کو منع کیا اور سمجھایا کہ آپ رہیں گے بھی تو الگ ہی رہنا پڑے گا، اس سے میری پریشانی کم نہیں ہوگی، اور آپ کو بلا وجہ پریشانی سے دو چار ہونا پڑے گا، بہر حال یہ دونوں افراد بڑے ہی رنج وافسوس کے ساتھ اپنے گھروں کے لئے روانہ ہوئے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ بھی مجھے لینے کے لئے دہلی ایئرپورٹ پر موجود تھے، اس سے یہ سہولت ہوئی کہ زائد سامان ان کے حوالہ کر دیا۔

سیاسی اثر ورسوخ کے حامل کئی احباب نے کوشش کی کہ میں کورنٹائن سے بچ جاؤں؛ لیکن چوں کہ اب تک ہندوستان میں کورونا کے جتنے کیسس آئے تھے، وہ باہر سے آنے

والوں ہی کے تھے؛ اس لئے یہ کوششیں نتیجہ خیز نہیں ہوسکیں، میں بھی دُعاء کررہا تھا کہ جس میں خیر ہو، وہ ہوجائے اور چوں کہ اس زمرہ میں اچھے خاصے لوگ شامل تھے تو ''مرگِ انبوہ جشنے دارد'' کے مصداق کلفت کا احساس کم ہوگیا؛ البتہ ایک بات بہت اچھی ہوئی کہ میرے تمام عزیزوں اور دوستوں نے بہ اصرار کہا کہ آپ حکومت کے قرنطینہ سینٹر میں جانے کے بجائے گورنمنٹ کی طرف سے معاوضہ لے کر ہوٹل میں قرنطینہ کا جو نظم کیا گیا ہے، اس کا انتخاب کریں؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، بعد کو گورنمنٹ کے قرنطینہ سینٹر کی جو کیفیات سنیں اور واٹس ایپ پر جو تفصیلات آئیں، اس سے اندازہ ہوا کہ یہ بروقت اور صحیح فیصلہ تھا۔

بہرحال مختلف مراحل سے گزر کر ہمیں ائیر پورٹ کے قریب لیمن ٹری ہوٹل لایا گیا، اور اس میں ہر آدمی کو ضروری سہولتوں سے آراستہ الگ الگ روم دیئے گئے، اس میں اگر کوئی تکلیف تھی تو وہ تھی تنہائی کی، کہ سوائے در ودیوار کے ۲۴ر گھنٹہ انسان کے سامنے کوئی اور چیز نہیں تھی، کھانا تو وقت پر مل جاتا تھا، اور غنیمت درجہ کا تھا، اس کی پانچ منزلوں میں قرنطینہ والے لوگ تھے؛ لیکن کسی کی دوسرے سے ملاقات نہیں تھی، ائیر پورٹ کی تکلیف دہ اور طویل الوقت کارروائیوں سے گزر کر جب بسوں کے ذریعہ ہم لوگ ہوٹل لائے گئے، تو بالکل ٹوٹ چکے تھے اور رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا، گویا پورے تیرہ گھنٹے ان کارروائیوں کی نذر ہوگئے، اور بہت ہی بے آرامی کے ساتھ گزرے، صبح سے کچھ کھانے کی نوبت نہیں آئی تھی، صرف دو تین بسکٹ ائیر پورٹ پر دیئے گئے تھے، اور ہوٹل میں کھانے پینے کا اس وقت کوئی نظم نہیں تھا، نیند کا سخت تقاضہ تھا؛ چوں کہ ۳۶ر گھنٹے سے آنکھ بند کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، میں نے اللہ کا نام لے کر سامان اپنی جگہ رکھا، وضوء کر کے چار رکعت نماز پڑھی اور خوب دُعاء کی کہ اگر میرے لئے یہاں رکنا ہی مقدر ہے تو اس میں خیر پیدا فرمادے اور برداشت کی طاقت عطا فرما، اس کے بعد بستر پر دراز ہوگیا، اور گہری نیند سو گیا، الارم کی آواز پر ہی فجر کے لئے اُٹھ سکا، اور نیند کے غلبہ کی حالت میں جیسے تیسے فجر کی نماز ادا کی اور پھر سو گیا، تقریباً نو دس بجے آنکھ کھلی، جب کہ ناشتہ آچکا تھا، ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ۲۴ر گھنٹے کا

نظام بنایا، جس میں نماز، تلاوت اور تسبیحات کے علاوہ مطالعہ اور لکھنے لکھانے کی مشغولیات بھی رکھی گئیں اور کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ مشغول رہا جائے؛ تاکہ تنہائی کا احساس کم ہو، اور یہ بھی طے کیا کہ فون پر بلاضرورت گفتگو سے بچا جائے؛ کیوں کہ ہر فون کرنے والا کچھ مزاج پرسی کرے گا، کچھ اظہار رنج اور کچھ تدبیروں کی رہنمائی، اس سے خواہ مخواہ کلفت کا احساس بڑھ جاتا ہے؛ چنانچہ اسی نظام کے تحت بحیثیت مجموعی وہاں کے اٹھارہ دن گزارنے کی نوبت آئی، اس درمیان ہم نے شمع فروزاں کے دو طویل مضامین لکھائے، جو دو دو قسطوں میں شائع ہوئے، یہ فل اسکیپ سائز میں تقریباً بیس صفحات ہیں، بعض احباب کی کتابوں پر تقریظات لکھی گئیں، جو میرے ذمہ قرض تھیں، ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے کورونا سے متعلق سوالات کے جوابات دیئے گئے، ایک عزیز دوست کی خواہش کی تعمیل میں ان کے مسودہ پر نظر ثانی بھی کی گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے سب سے زیادہ جس بات کا احساس ہوا، وہ یہ کہ جو قلم میرے پاس ہے، وہ قریب الختم ہے اور کاغذ کے بھی چند اوراق ہی بچے ہیں، ہوٹل والوں نے اپنے معمول کے مطابق ہر کمرہ میں ایک چھوٹا سا پیڈ اور پنسل رکھا تھا، ہوٹل والوں سے کاغذ اور قلم کا مطالبہ کیا تو انھوں نے معذرت کی، پھر میں نے رفیق عزیز مولانا امتیاز احمد صاحب سے کچھ دواؤں، بسکٹ اور قلم کاغذ پہنچانے کے لئے کہا، وہ باوجود قانونی بندشوں کے کسی طرح لے کر آئے؛ لیکن کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں تھی، استقبالیہ پر انھوں نے صرف دوائیں وصول کیں اور کاغذ و قلم کے بہ شمول تمام چیزیں واپس کر دیں، ایک دو دن کے بعد ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر آئیں، وہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے لوگوں کے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں، میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ میرے لئے صرف ایک قلم فراہم کر دیں تو مجھے اپنے احساسِ تنہائی کو کم کرنے میں بہت مدد ملے گی، انھوں نے بہت ہمدردی سے میری بات سنی اور کمرہ کے باہر سے کہا کہ یہاں تو کوئی قلم نہیں ہے؛ لیکن میرے پاس جو قلم ہے، وہ تمام لوگوں کی رپورٹ لکھنے کے بعد آپ کو بھیج دوں گی؛ مگر یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوسکا، کئی احباب نے

اور بچوں نے مشورہ دیا کہ اس کا ایک متبادل یہ ہے کہ آپ جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں، واٹس ایپ پر وائس میسیج کے ذریعہ ریکارڈ کر کے بھیج دیں، یہ مشورہ بہت مفید ثابت ہوا، اور میں نے معمول بنالیا کہ روزانہ عصر سے عشاء تک موبائل کے ذریعہ اپنی بات ریکارڈ کر کے بھیجتا، معہد میں شعبۂ تحقیق کے رفیق عزیزی مولانا محمد ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ اسے نوٹ کرتے، اور محب عزیز مولانا محمد محبوب عالم قاسمی (ناظم کتب خانہ) اسے کمپوز کر کے واٹس ایپ پر مجھے بھیج دیتے، پھر میں اس کی پروف ریڈنگ کرتا، اس طرح اندازہ ہے کہ اس عرصہ میں کمپوز شدہ پچاس ساٹھ فل اسکیپ سائز صفحات لکھانے میں کامیاب ہو سکا، اس کے علاوہ کتاب الفتاویٰ کے کچھ صفحات پر نظر ثانی کی، جو میرے ساتھ تھی، اور بہت سے لوگوں کے زبانی سوالات کے جواب دیئے، عجیب اتفاق ہے کہ چودہ دن کی یہ مدت بڑھ کر اٹھارہ دن ہوگئی؛ کیوں کہ میڈیکل آلات اور عملہ کی کمی کی وجہ سے سمپل لینے میں دو دن لگ گئے اور رپورٹ آنے میں بھی دو دن لگ گئے، اس طرح اٹھارہویں دن اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے دفتر جامعہ نگر اوکھلا پہنچ سکا۔

ان صبر آزما لمحات کا ایک خوشگوار پہلو یہ بھی ہے کہ بہت سے بزرگوں اور دوستوں کی محبتیں اور دُعائیں بھی حاصل ہوئیں، شیخ طریقت حضرت مولانا منیر احمد مظاہری دامت برکاتہم سے فون پر گفتگو ہوئی، انھوں نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ تنہائی بھی ایک بڑی نعمت ہے، مشائخ وصوفیاء تو تنہائی کے متلاشی رہا کرتے تھے، ان شاء اللہ اس میں بھی خیر ہوگا، سید العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم بھی خبر گیری فرماتے اور اپنی دُعاؤں سے نوازتے رہے، محترم جناب اسدالدین اویسی صاحب نے بھی بڑی فکر کی، دہلی میں قیام کے لئے اپنی سرکاری رہائش گاہ کی پیشکش بھی فرمائی، اس وقت سفر کا پاس حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، ان ہی کی کوشش سے یہ مسئلہ حل ہوا، محب گرامی حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی بھی مختلف سہولتیں پہنچانے کو کوشاں رہے اور مزاج پرسی بھی کرتے رہے، برادر گرامی قدر حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی زید مجدہ (مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) بھی

برابر استفسار حال کرتے رہے، اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک سے بہت سے احباب نے فون کر کے احساسِ کلفت کم کرنے کی سعی کی، فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

تنہائی کا سبق

اس تنہائی سے کئی سبق ملے، جن کا تذکرہ مفید ہوگا: اول یہ کہ جب ظاہری سہارے ختم ہوجاتے ہیں تو ایک مسلمان کے لئے اس پہلو سے یہ وقت اچھا ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف اس کا رُجوع بڑھ جاتا ہے، اور عام دنوں کے مقابلہ عبادت اور ذکر و دُعاء کی زیادہ توفیق میسر آتی ہے؛ اسی لئے قدیم زمانہ میں صوفیاء پہاڑ کی چوٹیوں اور زمین کے اندر تہہ خانوں میں بیٹھ کر چلہ کشی کیا کرتے تھے، مجھے اختیاری طور پر تو اس خلوت نشینی کی توفیق نہیں ہوئی؛ لیکن اضطراری طور پر جو موقع میسر آیا، اس سے ایک گونہ نشاط بھی حاصل ہوا، اور اس خیال کو تقویت ہوئی کہ جیسے ہم اپنے اہل تعلق، رشتہ داروں، دوستوں اور کاروباری مشاغل کے لئے وقت نکالتے ہیں، اسی طرح روزانہ کچھ وقت ایسا بھی رکھنا چاہئے جس میں ہمارے اور ہمارے خدا کے سوا کوئی اور نہ ہو، یہ وقت اللہ کو یاد کرنے، اس سے مانگنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے میں خرچ ہو، کاش ہمیشہ اس کی توفیق میسر ہو!

دوسرا سبق یہ ہے کہ دینی اور علمی مشاغل سے آخرت میں جو کچھ نفع ہوگا، وہ تو انشاءاللہ ہوگا ہی؛ لیکن یہ عمل دنیا میں بھی اطمینان قلب کا باعث بنتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' (الرعد: ۲۸) جب میں ہوٹل پہنچا، تو طبیعت میں گھبراہٹ تھی، اضطراب تھا؛ لیکن جب نماز پڑھ کر اللہ سے دُعاء کر لی اور پھر اپنے چوبیس گھنٹے کا کچھ اس طرح نظام بنایا کہ کھانے اور سونے کے علاوہ سارا وقت کسی نہ کسی دینی و علمی عمل میں مشغول رہے، تو یہ بے قراری جاتی رہی، اس بات کی فکر تو ستاتی تھی کہ میڈیکل رپورٹ کیا آئے گی؟ لیکن احساس تنہائی کا غم نہ ہونے کے درجہ میں ہوگیا؛ بلکہ جب گھر کے لوگوں کا اور دوست احباب کا فون آتا اور وہ تسلی کے کلمات کہتے تو میں اپنے بارے میں پورے اطمینان

کا اظہار کرتا اور عرض کرتا کہ لاک ڈاؤن کے درمیان آپ بھی فارغ وقت کا صحیح استعمال کریں، موجودہ حالات میں احتیاطی تدابیر کا پورا خیال رکھیں، اور دُعاء واستغفار کا اہتمام کریں۔

تیسرا سبق جو اس وقفہ امتحان سے حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ اگر آدمی کسی کام کا جذبہ رکھتا ہو اور عزم مصمم کر لے تو وہ کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں اپنے کام کو جاری رکھ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دیتے ہیں، آج کل نوجوان فضلاء عام طور پر شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمیں یکسوئی حاصل نہیں ہو پاتی ہے، وقت نہیں ملتا ہے، کتابیں میسر نہیں ہیں؛ لیکن اگر انسان کسی کام کے لئے اپنے اندر عزم مصمم پیدا کر لے تو وہ کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں اپنے لئے کام کا راستہ نکال سکتا ہے، ہمارے بزرگوں نے اسی طرح دین کی خدمت انجام دی ہے، یہاں تک کہ انہیں اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا اور وہیں سے انھوں نے المبسوط جیسی ضخیم اور عظیم کتاب املاء کرا دی، علامہ ابن تیمیہؒ نے قید خانہ ہی میں ڈھیر ساری علمی خدمت انجام دی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اسارت مالٹا کے درمیان بہت ہی کم وقت میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیا اور اپنے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کو تراویح میں سنایا، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں گزشتہ ادوار کے مقابلہ علمی مشاغل کو جاری رکھنا آسان ہو گیا ہے، آپ کے چھوٹے سے موبائل میں ایک بڑی لائبریری محفوظ ہو سکتی ہے، اگر آپ سفر میں ہوں، قلم کاغذ کا استعمال نہیں کر سکتے ہیں تو جن لوگوں کو تیز ٹائپ کرنے کا سلیقہ ہے، وہ تو براہ راست اپنی چیزیں موبائل کے ذریعہ کمپوز کر سکتے ہیں، اور جو میری طرح اس کا سلیقہ نہیں رکھتے، وہ آواز محفوظ کر کے یا دوسرے کو بھیج کر اپنے مافی الضمیر کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

بہر حال ۱۸/اپریل کی شام ۵ بجے مجھے قرنطینہ سے نجات ملی اور ہوٹل ہی کی گاڑی سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے دفتر اوکھلا پہنچ کر مغرب کی نماز ادا کی، یہ میرے لئے بے حد مسرت انگیز لمحہ تھا، یہاں میرے استقبال کے لئے شعبۂ علمی کے رفیق عزیز مکرم مولانا امتیاز

احمد قاسمی اور اکیڈمی کے خادم عبدالقیوم سلمہ موجود تھے، مجھے ایسا لگا کہ میں گویا اپنے گھر پہنچ چکا ہوں، گھر کے لوگوں نے بھی اطمینان کی سانس لی، دوست احباب اور رشتہ داروں کی طرف سے ڈھیر سارے فون آئے اور مبارکباد پیش کی گئی، دہلی میں موجود بعض اقرباء، شاگرد اور دوست احباب آ کر ملاقات کرنے کے متمنی تھے؛ لیکن قریبی علاقے میں بیماری کے پھیلاؤ اور لاک ڈاؤن میں سختی کی وجہ سے میں نے ان حضرات کو منع کر دیا اور عرض کیا کہ فون پر ہی ہم لوگ رابطہ رکھیں اور ایک دوسرے کے حق میں دُعائے خیر کا اہتمام کریں۔

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا قاری محمد صدیق باندویؒ جہاں اپنے اخلاق کے اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے اور ان کی سادگی اور بے نفسی کو دیکھ کر عہد صحابہ کی یاد تازہ ہوتی تھی، وہیں ان کی ایک اہم خدمت طلبۂ مدارس کے لئے اُردو زبان میں فن کی ابتدائی نصابی کتابوں کی ترتیب بھی ہے، حیدرآباد میں اہل علم کی ایک مجلس میں اس حقیر نے عرض کیا کہ آں مخدوم 'علم کلام' پر بھی اُردو میں کوئی نصابی کتاب مرتب فرما دیتے تو بہت بہتر ہوتا؛ کیوں کہ طالب علم اس مضمون کی الف، ب سے بھی واقف نہیں ہوتا ہے اور سیدھے شرح عقائد پڑھتا ہے تو اسے بڑی دشواری ہوتی ہے، قاری صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ کا احساس صحیح ہے اور واقعی اس کی ضرورت ہے، پھر فرمایا: اب میری عمر بھی زیادہ ہے اور وقت کی کمی بھی ہے؛ چوں کہ آپ کی زبان آسان اور عام فہم ہوتی ہے؛ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ ہی اس کام کو کر ڈالیں، اور میں آپ کے لئے دُعاء کرتا ہوں، اس کے بعد سے دل کے ایک گوشہ میں یہ خواہش موجود تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ کام لے لیں۔

یہ حقیر ہر سال رمضان المبارک میں یا تو پہلے سے جاری تصنیفی کام کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے، یا کسی نئے کام کا آغاز کرتا ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ رمضان کی برکتیں اور رحمتیں اس کام میں شامل جائیں گی؛ اس لئے ازبکستان کے سفر سے پہلے ہی معہد میں اپنا سبق مکمل کرنے کے بعد میں نے رمضان المبارک کے لئے اس کام کا پروگرام بنایا تھا، ذیلی عنوانات بھی قائم کر لئے تھے، کچھ مواد بھی اکٹھا کیا تھا، کچھ طلبہ سے کرایا تھا، اب جب اکیڈمی میں

قیام کی نوبت آئی تو پہلے تو اُمید تھی کہ جلد ہی لاک ڈاؤن ختم ہو جائے گا اور منزل کے لئے روانہ ہو جاؤں گا؛ اس لئے پڑھنے لکھنے کے کچھ ضمنی کام انجام دیئے؛ لیکن جب اطلاع ملی کہ یہ آگے بڑھ رہا ہے تو پھر عزیز مکرم مفتی جنید فلاحی سلمہ (اندور) کی یاددہانی پر اس دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی طرف ذہن گیا؛ کیوں کہ اکیڈمی کی لائبریری میں کتابیں موجود تھیں اور مولانا امتیاز صاحب جیسے پختہ کار اِملانویس بھی مہیا تھے؛ اس لئے اللہ کا نام لے کر غالباً ۱۴/اپریل ۲۰۲۰ء کو راقم الحروف نے ''آسان علم کلام'' کا کام شروع کیا۔

لیکن رمضان المبارک جیسے جیسے قریب آرہا تھا، گھر پہنچنے کی بے قراری بھی بڑھ رہی تھی، جب معلوم ہوا کہ ۳/مئی کو بھی بندشیں ختم ہونے کی اُمید نہیں ہے تو اب بے قراری اور بڑھ گئی، اور خیال ہوا کہ بذریعہ سڑک سفر کی کوشش کی جائے، اب ایک تو ڈیڑھ ہزار کیلو میٹر سے زیادہ کا کار کے ذریعہ سفر میری صحت کے لئے ایک جوکھم سے کم نہیں تھا، پھر میڈیا کے ذریعہ پھیلایا ہوا زہر، اور داڑھی ٹوپی والوں کے ساتھ نفرت انگیز سلوک کے تحت یہ سفر پُر خطر بھی تھا، پھر بھی ایک ڈرائیور محمد شانو تیار ہوئے، جن کے ساتھ میں دہلی سے مغربی یوپی کے مختلف علاقوں کا سفر کر چکا تھا، انھوں نے اطمینان دلایا کہ میں شہروں کے اندر داخل ہوئے بغیر باہر باہر سے لے کر چلوں گا اور ان شاء اللہ کوئی خطرہ نہیں ہوگا، بچوں اور دوستوں نے بھی ہمت دلائی، اب مسئلہ پاس حاصل کرنے کا تھا، جب کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، بالآخر حیدرآباد کے بعض سیاسی قائدین کی کوششوں سے پاس مل سکا، جس کے لئے حیدرآباد اور دہلی سے کم سے کم ہفتہ بھر کوششیں جاری رہیں، اس درمیان بعض غیر مسلم عہدیداروں کا بہت بہتر سلوک رہا، اگرچہ فون پر ہی بات ہوتی تھی؛ لیکن وہ بہت احترام سے پیش آتے اور جب تک میں حیدرآباد پہنچ نہیں گیا اور ڈرائیور دہلی واپس نہیں ہوگیا، وہ برابر خبر گیری کرتے رہے؛ اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ میڈیا کی شرانگیزیوں کے باوجود آج بھی غیر مسلم بھائیوں کی بڑی تعداد انسانیت اور انصاف ورواداری پر قائم ہے، بہر حال میں ۲۵/اپریل کو تراویح کے بعد اسلامک فقہ اکیڈمی کے دفتر سے روانہ ہوا

اور ۲۷/اپریل کی صبح ۷/بجے اپنے گھر پہنچ گیا، راستہ میں قدم قدم پر پولیس کی طرف سے چیکنگ ہوتی رہی؛ لیکن چوں کہ مجھے وزارت داخلہ کے واسطے سے پاس ملا تھا؛ اس لئے پاس دیکھتے ہی پولیس عہدیداروں کا رویہ بدل جاتا تھا، اور ایسا ہو جاتا تھا کہ گویا وہ ہماری تفتیش کے لئے نہیں؛ بلکہ استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔

اکیڈمی میں ۲۱/دنوں کے اس قیام کا فائدہ یہ ہوا کہ ''آسان علم کلام'' کا کام قریب قریب مکمل ہو گیا، حیدرآباد پہنچنے اور اوسان بحال ہونے کے بعد دو تین دنوں میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور یہ کئی مسرتوں کا باعث بنا، ایک تو گھر سے غیر اختیاری طور پر دُوری کے اوقات ضائع نہیں ہوئے، دوسرے: حضرت قاری صاحبؒ کے ایک حکم کی تعمیل کی سعادت حاصل ہوئی، تیسرے: ایک ضروری کام ہو گیا، میں نے ان صبر آزما دِنوں سے یہ سبق حاصل کیا کہ تنہائی، وطن سے دُوری اور معمول کی زندگی سے محرومی یقیناً بڑی زحمت ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر شر میں خیر کا اور ہر تکلیف میں راحت کا پہلو رکھا ہے، یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اس چھپے ہوئے خیر کو تلاش کرے اور وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔

● ● ●